کھڑکیاں

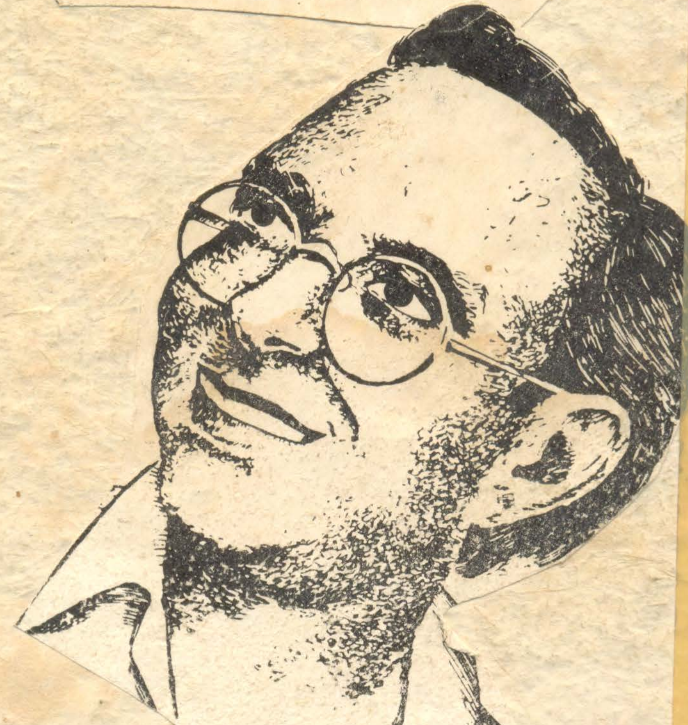

کرشن چندر

کھڑکیاں

عظیم تخلیقات کا انتخاب

کھڑکیاں

*

کرشن چندر

محمود پبلی کیشنز : چوک اردو بازار لاہور

جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ ہیں

ناشر : ———— محمد محمود الرّحمٰن
باہتمام ———— جاوید بیگ
باراوّل: ———— ۱۹۷۶ء

تعداد : ———— ایک ہزار

قیمت : ———— [redacted] روپے صرف

مطبع : ———— جنرل پرنٹرز لاہور

اِنتساب

اِنسانیّت کے روشن مُستقبل کے نام

کرشن چندر

کرشن چندر

کسی ایک قوم، ایک فرقے،
یا ایک نسل کا ادیب نہیں۔
وہ ساری انسانیت کا ادیب
ہے!

ترتیب

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۱۔	کھڑکیاں	۹
۲۔	سویٹ ہارٹ	۲۳
۳۔	کاغذ کا رشتہ	۳۲
۴۔	برہمن	۴۰
۵۔	ناگ اور شبنم	۵۱

نمبر شمار	عنوانات	نمبر صفحہ
۶۔	جنّت کے مزے	۵۸
۷۔	شانِ خدائی	۶۷
۸۔	چھڑی	۷۷
۹۔	چور	۸۶
۱۰۔	دو ہاتھوں کا اندھیرا	۹۹
۱۱۔	غسلیات	۱۰۸
۱۲۔	دُنیا کی سب سے بڑی کتاب	۱۱۵
۱۳۔	اونچا حساب	۱۳۱
۱۴۔	بڑا آدمی	۱۴۴
۱۵۔	نئی قمیص	۱۶۱
۱۶۔	کیا کروں	۱۸۵

کھڑکیاں

یکایک ماہتاب جھیل کی سطح پہ پھر کنول کے پھول کی مانند کھل گیا۔ اور گرانڈ ہوٹل کی ساری کھڑکیاں جو لبِ ساحل وا ہوتی تھیں ایک ایک کر کے کھلنے لگیں۔ اور ان کے چوکھٹوں سے طرح طرح کے سیاحوں کے چہرے باہر جھانکنے لگے۔

پورے چاند کی رات تھی۔ اس لئے پورا منظر دودھیا چاندنی میں ڈھل گیا تھا۔ دُور تک پہاڑوں کے سلسلہ ہائے دراز کسی خواب آفریں خاموشی میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے — بادلوں کے قافلے تنگ درے سے گزرتے ہوئے وہیں تھک کر سو گئے تھے۔ جھیل کے کنارے بوٹ کلب کی گلابی رنگت کی ہفت منزل عمارت یوں اُکڑوں تھی جیسے کوئی جوگی آلتی پالتی مارے دھیان میں مگن ہو۔ جھیل کے عین بیچ میں چاند، جیسے بچہ پالنے میں اور جھیل کی شفاف سطح کے چاروں طرف بید مجنوں کے سایوں سے الجھتی ہوئی لہراتی ہوئی وہ سنسان سڑک جیسے کوئی حسینہ آئینے

کے گرد اپنا ربن رکھ کر بھول جائے!

بے حد خوبصورت منظر تھا!

لیکن ہوٹل بھی بے حد خوب صورت تھا۔ لبِ ساحل کھلتی ہوئی کھڑکیوں کے فریم موتیا رنگ کے تھے۔ اُن کے اندر دوہرے رنگ دار پردے جھلملا رہے تھے۔ باہر کے پردے پھول دار ریشمی کپڑے کے۔ اندر کے پردے جھلملاتے ہوئے لیس کے۔ اور اُن پردوں کے اندر سے جھانکنے والی مخلوق بھی بہت خوب صورت تھی!

پہلی کھڑکی ——

ایک پارسی حسینہ کا چہرہ باہر جھانک رہا تھا۔ چہرے پر ایسی انوکھی مسکراہٹ ہے جیسے وہ دلکش پارسی حسینہ چاند کو نہیں، اپنی شادی کے کیک کو دیکھ رہی ہو۔ پہلے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتی ہے۔ پھر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہتی ہے۔

"اے فرام روز! فرام روز!!"

کمرے کے اندر سے ایک کڑوی سی آواز آتی ہے۔

"سوں چھے؟" (کیا ہے؟)

"مون چھے مون!" پارسی حسینہ اطلاع دیتی ہے۔ "جلدی آڈُونی!"

"میں کام کر رہا ہوں!"

مرد پھر سخت لہجے میں کہتا ہے۔

"کام سو کلادی دیو (کام ختم کر دوں) جلدی آڈُونی —— رومانٹک بچارہ ——"

"اوڈیم!"

کہہ کر مرد بھی کھڑکی میں آتا ہے۔

اُس کی آدھی چندیا گنجی ہے اور آدھی ناک آگے کو مُڑی ہوئی ہے۔ تقریباً ایک ہک کی طرح۔ وہ ناک ایسی ہے کہ اُسے بآسانی جھیل کے پانی میں ڈال کر مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں۔ مرد پہلے تو بے حد خفا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن باہر کا نظارہ دیکھ کر نرم پڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر بیتے ہوئے دنوں کے حسین سائے جھلملانے لگتے ہیں۔ وہ پارسی حسینہ اس کے بالکل قریب آجاتی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور کہتا ہے۔

”کھورسید!“

”ہاں فرام روز!“

”تم کو یاد ہے اتنا ہی بڑا مُون تھا۔ بلکہ اس سے بھی بڑا ہوگا۔ جب ہم تمہارے گھر کی ٹیرس پر کمبالاہل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور تمہارے باپ نے مجھ کو سادی کے لئے نان کر دی تھی۔“

”ہاں یاد ہے۔ پھر تم نے میرے باپ کو اپنے باپ کی پاس بک دکھائی تھی اور میرے باپ کو یقین ہوگیا تھا کہ تمہارا باپ بھی میرے باپ کی طرح لکھ پتی ہے۔“

”پھر تمہارے باپ نے میرے باپ کی پاس بک واپس کر دی تھی۔ اور تمہاری میری سادی نکس کر دی تھی۔ یاد ہے؟“

”اوں — !“

کہہ کر خورشید بائی نے فرام روز کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ فرام روز تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔

”کھورسید!“

”ہاں فرام روز!“

”اگلے سال ہم لوگ دارجلنگ چلیں گے۔ سُنا ہے اُدھر مُون لائٹ کا نجارہ بہت ہائی

کلاس ہوتا ہے۔"

"مُون لائٹ نہیں ڈارلنگ، "سَن سَیٹ" جب سُورج پہاڑ کے پیچھے غرق ہوتا ہے!"

"تو اگلے سال ہم لوگ دارجلنگ سن سیٹ دیکھنے چلیں گے۔ لیکن اُدھر کا مون لائٹ بھی گجب کا ہے۔ اِک دم ممبئی کے جوہو کے مافق ہے!" پھر دونوں تعریفی نگاہوں سے چاند کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

دوسری کھڑکی ـــ

گھنگھریالے بالوں والا، شاعرانہ آنکھوں والا، رنگین بُش شرٹ والا ایک خوبصورت وجیہہ نوجوان کھڑکی میں کھڑا ہو کر چاند کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھرتا ہے۔

یکایک کمرے کے اندر سے ایک آواز آتی ہے۔

"دنیش ـــ دنیش ـــ!"

نوجوان سگریٹ کا ایک کش زور سے لے کر سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیتا ہے اور پھر بُرا سا مُنہ بنا کر کہتا ہے۔

"ہاں شرمشٹھا! کیا ہے؟"

"گیارہ بج گئے۔ کب سوؤ گے؟"

نوجوان کھڑکی سے منہ پھیر کر کمرے کی طرف دیکھتا ہے۔ "ابھی نیند نہیں آتی۔"

پھر وہیں کمرے کے اندر سے آواز آتی ہے۔

"پلنگ پر لیٹو گے تو آ جائے گی۔"

"تم سو جاؤ میں آتا ہوں۔ ذرا ایک سگریٹ اور پی لوں۔"

یہ کہہ کر وہ نوجوان اپنی جیب سے ڈبیا نکال کر اس میں سے ایک سگریٹ نکالتا ہے اور

لائٹر سے جلاتا ہے۔

اور چاند سے پوچھتا ہے۔

"نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

اتنے میں شرمشٹھا کھڑکی میں آ جاتی ہے۔ چھوٹے قد کی، بھاری جسم کی، کھُٹّے ہوئے بالوں والی بے حد بدصورت عورت ہے۔ جیسے اس کے گہرے میک اَپ نے اور بدصورت کر دیا ہے۔ آتے ہی وہ ونیش کا بازو پکڑ کر اُسے اندر کمرے کی جانب گھسیٹتے ہوئے کہتی ہے۔ رات بھر چاند کی طرف دیکھتے رہو گے تو نیند کیسے آئے گی (گھڑی دکھا کر) دیکھتے نہیں ہو گیارہ بج چکے ہیں۔ چلو اب سو جائیں۔"

"تم جاؤ۔ میں بعد میں سو جاؤں گا!"

شرمشٹھا (بہت پیار سے) "چلو ونیش۔" اس کا بازو پکڑ کر پھر گھسیٹتی ہے۔ ونیش غصّے سے بازو چھُڑا کر تقریباً چیخ کر کہتا ہے۔

"کہہ جو دیا۔ میں بعد میں سو جاؤں گا۔ بار بار پریشان کیوں کرتی ہو؟"

شرمشٹھا کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ زور زور سے روتے ہوئے کہتی ہے۔

"جب دیکھو چاند کی طرف دیکھتے رہتے ہو۔ میری طرف کبھی نہیں دیکھتے کیا رکھا ہے اس مُوئے چاند میں؟"

شرمشٹھا روتے ہوئے کھڑکی سے چلی جاتی ہے۔

چند لمحوں تک اُس کی سسکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھر ونیش غصّے میں آ کر زور سے کھڑکی بند کر دیتا ہے۔

تیسری کھڑکی —

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑکی سے لگا چاند کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں

شراب کا گلاس ہے دوسرے میں سگریٹ۔ کبھی ایک کش لگاتا ہے۔ کبھی ایک گھونٹ پیتا ہے ، کبھی چاند کی طرف بے چین سی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ پھر گھبرا کر اپنی گھڑی دیکھنے لگتا ہے۔ پھر کھڑکی سے کمرے کے اندر چلا جاتا ہے۔ کھڑکی چند لمحوں کے لئے خالی ہو جاتی ہے اتنے میں کمرے سے گھنٹی بجنے کی تیز آواز آتی ہے۔ پھر وہی ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑکی میں آجاتا ہے۔ اور تیزی سے شراب کے دو تین گھونٹ اور سگریٹ کے دو تین کش لگاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی بے چینی دم بدم بڑھ رہی ہے۔

اتنے میں کھڑکی میں اس کے قریب ہوٹل کا ایک بیرہ نمودار ہوتا ہے۔

”یس سر!“

”ارے وہ ابھی تک نہیں آئی ؟“

”بس آتی ہی ہوگی حضور !“

”کب آئے گی ؟“

”اس نے بولا تھا گیارہ بجے کے بعد آئے گی ۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم خود گئے تھے اسے لینے کے لئے ؟“

”حضور جو ٹھیک ٹھیک پوچھتے ہو تو میں تو نہیں گیا تھا۔ کیونکہ مجھے منیجر صاحب نے کافرہل والی میم صاحب کے بنگلے پہ بھیج دیا تھا۔ اس لئے میں گیارہ نمبر کے بیرے کو بول گیا تھا۔“

”وہ کیا بولتا ہے ؟“

”وہ بولتا ہے صاب کہ اسے اٹھرہ (اٹھارہ) نمبر کی میم صاب نے ٹیلی گرام دینے کے لئے پوسٹ آفس بھیج دیا تھا۔ اس لئے وہ جاتے جاتے نو نمبر کے بیرے سے کہہ گیا تھا۔“

”نو نمبر کا بیرہ کدھر ہے ؟ اس کو بلاؤ ادھر !“

"نو نمبر کا بیرہ اپنے گھر گیا ہے جی۔ پھر وہ مجھ کو بول گیا کہ وہ اس کو بولنے کے لئے گیا تھا۔ مگر وہ گھر پر نہیں تھی۔ تو وہ اس کے گھر پر کسی سے بول کے آیا کہ وہ اِدھر گیارہ بجے آجائے۔ اور وہ بولے کہ ہم اس کو بول دے کہ تم بولتا ہے کہ صاب نے بولا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"شٹ اَپ!"

سہم کر۔

"جی حضور!"

"گٹ آؤٹ!"

"یس سر!"

بیرہ جلدی سے کھڑکی سے غائب ہو جاتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی چاند کی طرف دیکھتے ہوئے شراب کا گلاس خالی کر دیتا ہے اور کھڑکی سے مُڑتے ہوئے کہتا ہے۔

"ایسی خوب صورت چاندنی رات غارت ہو گئی — بلڈی سوائن —!"

چوتھی کھڑکی —

کھڑکی کے ایک پٹ پر ایک نوجوان بہت ہی خوب صورت پوز بنائے کھڑا ہے۔ اُس کے بالکل سامنے ایک پری جمال لڑکی تنگ اور چُست قمیص، اور شلوار پہنے اس طرح کھڑی ہے جیسے وہ کیمرے کے سامنے کھڑی ہو۔ لڑکی مشہور ہیروئن چاند بالا ہے۔ لڑکا مشہور ہیرو سکھدیو راج ہے۔ لڑکا پیار سے چاند بالا کو مرجائی کہہ کر پکارتا ہے۔ لڑکی لاڈ سے ہیرو کو ٹچو کہتی ہے۔

ہیرو۔ "مرجائی!"

ہیروئن۔ "ٹچو!"

ہیرو۔ "یہ چاند تم سے خوب صورت نہیں ہے!"

ہیروئن ۔ "لیکن تم چاند سے زیادہ خوب صورت ہو!"

ہیرو ہنس پڑتا ہے۔ پوز بدلتا ہے اور کہتا ہے۔

ہیرو ۔ "یہ کس فلم کے ڈائلاگ تھے؟"

ہیروئن ۔ "بھول گئے "میں مرگئی سیاں" کے تھے۔"

ہیرو ۔ "بڑے پیارے ڈائلاگ لکھے تھے سیلاب لکھنوی نے۔"

ہیروئن ۔ "سیلاب لکھنوی نہیں سحاب لکھنوی نے۔"

ہیرو ۔ "اچھا!"

ہیروئن بہت پیار سے اچھا کہہ کر پوز بدلتی ہے۔ ہیروئن کے پوز بدلنے سے ہیرو بھی فوراً پوز بدلتا ہے اور کہتا ہے۔

ہیرو ۔ "مرجانی!"

ہیروئن ۔ "پٹھو!"

ہیرو ۔ "دیکھو ایک چاند آسمان پر ہے، ایک جھیل میں ہے۔ ایک میری کھڑکی میں ہے!"

ہیروئن ۔ "ایک میری آنکھوں میں ہے، ایک میرے دل میں ہے ایک میری روح میں ہے۔"

ہیرو ۔ (دونوں بازو پھیلا کر) "آؤ اس چاندنی رات میں کہیں کھو جائیں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو جائیں۔ سچے پریم کے صابن سے جھوٹی محبت کے الزام کو دھو جائیں۔"

ہیروئن ۔ "یہ محبت ہے یا کسی صابن کمپنی کا اشتہار ہے!"

ہیرو ہنس کر اور لہجہ بدل کر کہتا ہے۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ وہ صابن کمپنی والوں ہی کی فلم کے ڈائلاگ تھے۔ کم بخت ایسے زبان پر چڑھ گئے ہیں کہ اصلی سچویشن پر بھی نقلی ڈائلاگ زبان پر آجاتے ہیں۔"

ہیرو کھڑکی سے ذرا ہیروئن کی طرف جھکتا ہے۔ اور آنکھوں میں اور لہجہ میں ایک خاص رنگ پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"مرجانی!"

ہیروئن بھی ہیرو کے قریب اتنا ہی جھکتی ہے اور سینے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہتی ہے۔

"پُچو! میرے پُچو!!"

اتنے میں کمرے کے باہر سے دروازے پر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور کوئی بھاری نسائی آواز میں کہتی ہے۔

"چاند بالا! چاند بالا!! اری تو دو منٹ کے لئے آئی تھی۔"

ہیروئن نے گھبرا کر کہا۔

"ماتا جی بلاتی ہیں۔ میں جاتی ہوں۔"

اُونچی آواز میں کہتی ہے۔

"آئی ماتا جی!"

اور مسکراتے ہوئے چلی جاتی ہے۔

کھڑکی میں ہیرو اکیلا کھڑا ہے۔ چاند کو دیکھ کر ایک نیا پوز دیتا ہے اور مسکراتا ہے۔

پانچویں کھڑکی ـــ

دو آدمی نائٹ گون پہنے کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں فائل ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں چند کاغذ ہیں۔

"ادئے کھنہ! میں کہتا ہوں اگر تو چیف سیکرٹری کو پٹالے تو پچاس لاکھ سے کم کا پرافٹ نہیں ہوگا!"

"سردار سنگھا! میں چیف سیکرٹری سے پٹالوں گا!"

”اوچھڈ یار! پہلے وی توُں ایسا ہی کہتا تھا خواہ مخواہ میرا دس ہزار روپیہ گُل کر دیا۔ اور کام بھی نہ بنا!“

”مگر میں اید کی کہتا ہوں کہ سردار سنگھا، تو دیکھتا جا۔ میں کیسے چیف سیکرٹری کو پٹاتا ہوں۔ (ذرا گھُوم کر کھڑکی سے باہر ایک نگاہ ڈال کر) اوئے سردار سنگھا آج تو فُل مُون ہے . . . .“

سردار، چاند کی طرف ایک سرسری سی نگاہ ڈال کے پھر پیٹھ موڑ لیتا ہے اور کہتا ہے۔

”اوئے چھڈ پُتر مُون وا۔ دھیان کر آٹے نوُن دا۔ اگر توُں چیف سیکرٹری کو پٹالے تو اِسی سودے میں پچاس لاکھ کا پرافٹ ہے اور میں تجھ کو تیری کمیشن کے علاوہ پندرہ پرسنٹ پارٹنرشپ! اب یہ دیکھ اور حساب کر کہ اگر فُل پلانٹ گورنمنٹ منظور کر دے تو؟“

اتنا کہتے ہوئے سردار سنگھ کھنہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے اُسے کھڑکی سے پرے کمرے میں لے جاتا ہے۔ کھڑکی خالی ہو جاتی ہے۔

چھٹی کھڑکی —

ایک میانہ قد کے آدمی کا سنجیدہ اور گمبھیر چہرہ چاند کی طرف دیکھ کے خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ پیچھے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوتی ہے۔ لیکن اُس آدمی کے سوچ میں ڈوبے ہوئے چہرے سے معلوم ہوتا ہے جیسے اُسے اُس دستک کا کوئی علم نہیں ہوا۔ وہ آدمی اُسی طرح چاند کی طرف دیکھتا ہوا اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

اتنے میں کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے۔ سوچ میں ڈوبے ہوئے آدمی کو اُس دبی دبی آہٹ کا بھی علم نہیں ہوتا۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے ایک خوب صورت عورت دبے پاؤں چلی آتی ہے۔ اُس نے گھوڑسواری کا لباس پہن رکھا ہے۔ کھُلے کالر والی قمیض اور بلو جودھپور۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چابک ہے۔

کھڑکی کے قریب آکر وہ مرد کی طرف غور سے دیکھتی ہے جو سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔

اُسے دیکھ کر آپ ہی آپ مُسکراتی ہے۔

پھر بالکل قریب جاکر اُس کے کندھے پر سر رکھ دیتی ہے۔

وہ آدمی چونک جاتا ہے۔

اور اُس عورت کی طرف گھومے بغیر ایک ہاتھ سے اُس کی زُلفوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگتا ہے۔

عورت کہتی ہے۔

"چاندرات میں گھوڑے کی سواری، بے حد لطف آیا۔ کاش تم بھی چل سکتے!"

"جب جوڑوں کا درد جاتا رہے گا تو میں بھی چلا کروں گا۔"

"اُف مجھے تو پھر بھوک لگی ہے۔!"

"گھوڑ سواری کے بعد بے حد بھوک لگتی ہے۔"

"کیا کھاؤں؟"

"ٹفن کیریر میں چکن سینڈوچ رکھے ہیں۔ وہ کھولا۔"

وہ عورت چند لمحوں کے لئے کھڑکی سے غائب ہو جاتی ہے۔ اب جو آتی ہے تو چکن سینڈوچ کھاتے ہوئے آتی ہے۔ اور کھاتے کھاتے پوچھتی ہے۔

"تم کیا کرتے رہے؟"

"میں چاند کو دیکھتا رہا اور تمہارا انتظار کرتا رہا۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ تم تو کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے (قریب آکر شوخی سے) کس کی یاد ستا رہی تھی؟"

"تمہاری!.... تمہارے ہوتے ہوئے اس خوبصورت چاندنی میں بھلا کسی اور کی یاد آ

سکتی ہے ؟"

عورت : (خوشی سے آہ بھر کر) "ہاں یہ چاند بے حد خوب صورت ہے۔ اس نے زندگی کے ہر گام پہ ہماری محبّت کو راستہ بتایا ہے۔ اس نے ہماری آہیں سُنی ہیں۔ ہمارے آنسو بھی دیکھے ہیں۔ ہماری پیار کی باتیں بھی سُنی ہیں۔ ایک ایک کر کے یاد کرو۔ وہ ساری حسین چاندنی راتیں ۔ ہائے مجھ سے تو کوئی ساری دُنیا لے لے۔ میرا چاند مجھے دے دے !"

مرد : "ایک دن بھی آئے گا۔ انسان نے ستاروں پر کمند پھینکی ہے ۔ چاند سے پہلے ہمارے دام میں آئے گا۔ !"

عورت : "ہائے میرا جی چاہتا ہے میں سپوتنک پر بیٹھ کر سب سے پہلے چاند پہ جاؤں ۔"

کھڑکی کے نیچے سے یکایک ایک آواز بلند ہوتی ہے ۔

"ایک روٹی دے دو۔ صبح سے بھوک لگی ہے ۔ میم صاحب کی جوڑی سلامت رہے۔ ایک روٹی دے دو ۔"

مرد اور عورت دونوں گھبرا کر کھڑکی کے نیچے دیکھتے ہیں تو ان کی کھڑکی کے بالکل قریب، بھوری بجری کے فرش پر پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے آٹھ نو سال کی عمر کی ایک لڑکی کھڑی ہے۔ دُبلا پتلا، بھوکا چہرہ، بھوکے ہونٹ، بھوکی نگاہیں۔ پتلی باہیں دستِ سوال بن کر اُوپر اٹھتی ہوئیں۔

"ایک روٹی میم صاحب !"

وہ عورت جو سینڈوچ کھا رہی ہے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے سینڈوچ کو دیکھتی ہے ۔

یکایک مرد اُسے روک دیتا ہے ۔

اور نیچے دیکھ کر ذرا بلند آواز میں لڑکی سے پوچھتا ہے ۔

"چندا ماما لے گی؟"

"روٹی بابو جی!"

"دیکھ تیرے چندا ماما کتنے خوب صورت ہیں۔ بتا چاند میں جائے گی؟" وہ مرد پھر بولا۔

"روٹی بابو جی!"

بے سمجھے بوجھے اُس لڑکی نے سینڈ وِچ کی طرف دیکھ کر رَٹ لگا رکھی تھی۔

"کیا کرتے ہو، اُس غریب بچی کو کیوں پریشان کرتے ہو؟"

وہ عورت غصّہ سے بولی۔

اور اپنا سینڈوِچ نیچے بھکارن کی غریب بچّی کی جھولی میں گرا دیا۔

سینڈوِچ لیتے ہی فوراً وہ بھکارن وہاں سے بھاگ گئی۔ اب وہ تیزی سے سینڈوِچ کھاتی جا رہی تھی اور بھاگتی جا رہی تھی۔ اور پیچھے مُڑ کر دیکھتی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کے پیچھے تعاقب کرتا ہوا اُس کا سینڈوِچ چھیننے کے لئے آ رہا ہو۔

عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مرد نے کہا۔

"جو لوگ اُوپر کی منزل میں رہتے ہیں وہ لوگ ضرور چاند میں جائیں۔ اور چاند حاصل کر لیں۔ چاند پر جانا اچھا ہے اور انسانیت کے لئے مفید بھی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو نچلی منزل میں رہتے ہیں ان کروڑوں انسانوں کو تو ابھی تک تو وہ چاند بھی نہیں ملا جو آدھ پاؤ گیلے آٹے سے تیار ہوتا ہے۔ اور شب و روز کی محنت سے پیٹ میں اُترتا ہے۔

بالائے افلاک خلاؤں میں گھومنے والو! ایک نظر زیرِ افلاک بھی ڈالو اور دیکھو کہ کس مصیبت سے انسان ابھی تک اُس ننھے سے سپوتنک کو ڈھونڈ رہا ہے جس کا نام روٹی ہے ——!"

”یہ تمہاری فلاسفی کی کلاس نہیں ہے۔ تم یہاں ہل اسٹیشن پر آرام کرنے کے لئے آئے ہو۔“

اس عورت نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بڑے فخر اور پیار سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

”چلو اب آرام کرو۔ رات بہت بیت گئی ہے۔“

وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑکی سے پرے چلے گئے۔

نیچے جھیل میں چاند لہروں کے پالنے میں لیٹا ہمک رہا ہے اور مسکرا کر ساتویں کھڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے۔!!

سویٹ ہارٹ

سیر و سیاحت ایک مشغلہ ہے۔ ایک فیشن ہے۔ ایک انڈسٹری ہے۔ ایک ضرورت ہے لیکن جو لوگ سیر و سیاحت کو کہیں نہیں جاتے یا نہیں جا سکتے۔ ان کے لئے دردِ سر بھی ہے۔ میرا ایک دوست ہے۔ بے تکلف جانی جگری دوست ہے۔ گل بھوشن اس کا نام ہے۔ سیر و سیاحت اس کا کام ہے۔ سال میں چار پانچ مہینے وہ پہاڑوں کی سیر: سیاحت میں مشغول رہتا ہے۔ اکیلا آدمی ہے نہ بیوی نہ بچے۔ سکریو بنانے والی ایک چھوٹی سی فیکٹری کا مالک ہے۔ نہ کوئی فکر ہے نہ فاقہ۔ اور اپنا یہ حال ہے کہ سال میں ایک ہفتے کی چھٹی بھی لے لیں تو سمجھ میں نہیں آتا وقت کیسے کٹے۔ تاش کا مجھے شوق نہیں ہے۔ پہاڑوں پر بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جانے کے لئے پیسہ نہیں۔ البتہ کبھی کبھی آٹھ دس دنوں کے لئے اپنے گاؤں ہو آتا ہوں۔ جہاں میرے ماں باپ رہتے ہیں۔ بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جاتا ہوں۔ صاف ہوا ملتی ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کی فضا ملتی ہے۔ قریب

کی دھرا ندی میں جب چاہو نہاؤ۔ جتنا جی چاہے تیرو۔ کوئی منع کرنے والا نہیں۔ بھیڑ بکریوں کے گلے چرواہوں کی بنسی کی دلدوز پکار، مجھے تو اپنے گاؤں جاکر اپنے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ بیوی بچے کُڑھتے رہتے ہیں کہ انہیں کسی پہاڑ پر کیوں نہیں لے جاتا۔ لیکن فیملی بجٹ کا معاملہ اُن کی سمجھ میں کب آنے لگا ہے۔ اس لئے وہ بھی اب کُڑھ کُڑھ کر مجھ سے جاتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے پہاڑی مقامات کی رُومانی داستانیں سُن سُن کر رشک و حسد سے جلتے رہتے ہیں۔ کُڑھتا تو میں بھی ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ میرا گاؤں کسی طرح ہل سٹیشن نہیں کہلا سکتا۔ پہاڑ تو کیا وہاں ایک ٹیلہ تک نہیں ہے۔ نہ جھیل۔ نہ مرغزار نہ کوئی گلزار۔ اس کا نام بھی عجیب سا ہے: "کُدّو بھیڑا" اب کسی سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اب کے چھٹیوں میں کُدّو بھیڑا گئے تھے۔ کُدّو بھیڑا کسی ہل سٹیشن کا نہیں ہو سکتا۔ نام ہوتے ہیں۔ نینی تال۔ کوڈائی کنال، گُل مرگ۔ سون مرگ۔ پہلگام۔ کُلّو۔ منالی۔ دارجیلنگ۔ نام سنتے ہی آنکھوں میں نشہ سا چھانے لگتا ہے۔ روح میں سُرور سا آنے لگتا ہے۔ اس لئے میں کسی سے نہیں کہتا کہ میں چھٹیوں میں کُدّو بھیڑا گیا تھا۔ بس کہتا ہوں اپنے گاؤں گیا تھا اپنے ماں باپ سے ملنے پھر میں اپنے ہیڈ کلرک سے سوال کرتا ہوں اور آپ کہاں گئے تھے مسٹر ستیہ پال؟

"نینی پال!" ستیہ پال فخر سے جواب دیتا ہے۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ نینی تال کی تعریف میں مصروف ہوتا ہے۔ یاٹ کلب اور سوئیس ہوٹل۔ چائنا پیک۔ جھیل کی سیر۔ ڈانڈی کی سواری پھولوں بھری وادیوں کا ذکر۔ بھیم تال کی تلہٹی میں ایک امریکی چھوکری سے میرا تعارف ہوا۔ وہ بھیم تال کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی، ساتھ کے کمرے میں میں ٹھہرا تھا۔ میں اُسے پُل کے نیچے مندر کی آرتی سُننے لے گیا۔ شام کا جھٹپٹا۔ شنکھ اور آرتی کی ملی جُلی آوازیں اور قریب کی جھاڑیوں میں چنبیلی کے پھول اُس کے نازک لبوں کے تبسّم کی طرح چمک رہے تھے۔ واپسی میں چڑھائی

چڑھتے ہوئے وہ لڑکھڑا سی گئی تھی اور اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں اُسے سہارا دے کر چڑھائی کے اُوپر پُل پر لیتا آیا تھا۔ پُل کے دوسرے کنارے ایک چشمے پر پہاڑی عورتیں اپنے گھڑے بھرتی ہوئیں کوئی پہاڑی گیت گنگنا رہی تھیں اُس دلربا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کی شفاف جھیل ایسی نیلی آنکھوں میں ستارے ناچ رہے تھے۔ رات کو ڈرنک کے لئے اُس نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی۔ بیٹلز کے گو گو ریکارڈ کی دُھن پر ہم دونوں ناچتے رہے اور مارٹینی پیتے رہے۔ پیتے رہے اور ایک دوسرے کے قریب آتے رہے۔ رسیلے ہونٹ مسکراتے رہے۔ باہر چھٹکی ہوئی چاندنی نہیں رہی تھی۔ اور اس رُومانی فضا سے ہم مسحُور ہوتے گئے۔ اور۔۔۔۔۔"

ستیہ پال چپ ہو گیا۔ اور میری سانس گہری ہوتی گئی۔ مُنہ سے پہلے ایک آہ نکلی۔ پھر ایک کراہ نکلی۔۔۔۔۔

"تم نے چھٹیاں کہاں گزاریں؟" ستیہ پال مجھ سے پُوچھنے لگا۔

"میں اپنے گاؤں گیا تھا۔" میں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔ تاکہ وہ میری آنکھوں کے آنسو نہ دیکھ سکے۔ میں نے ہولے سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے سیکشن آفیسر سے پوچھا۔ آپ کہاں گئے تھے؟"

سیکشن آفیسر بولا: میں منالی گیا تھا۔ وہاں سے کلو چلا گیا، دسہرے کا میلہ دیکھنے کے لئے۔ کلو کا میلہ دیکھنے کی چیز ہے۔ گُل پوش وادی کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ برف کی ٹوپیاں پہنے ہوئے۔ پہاڑی گدی ڈوگرہ لباس پہنے ہوئے اور غزالی آنکھوں والی، گلاب کی پتی ایسے رخساروں والی دلربا لڑکیوں کا رقص، اور دھیلو شراب خوشبودار چاول سے کشید کی گئی لوکل شراب جس سے پہاڑی لڑکیوں کے پُرشباب بدن کی خوشبو آتی ہے اور ڈھائی ہزار سال پرانے مندروں میں تھالیاں لے کر پھولوں سے بال سجائے عورتیں پُوجا کے لئے جاتی ہوئی، اکیلی دوپہر میں شفاف کہستانی ندی میں پاؤں لٹکائے مجھے ایک دوشیزہ مل گئی۔ جو اپنی گود میں ایک خوب صورت میمنے کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیر رہی

تھی میں نے اُس سے کہا . . . ."

میں نے یکایک اُس کی بات کاٹ کر کہا: "معاف کیجیئے گا۔ مجھے یہ ضروری کاغذات لے کر مسٹر گھوش کے پاس جانا ہے۔"

میں یونہی ایک غیر ضروری سی فائیل اُٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا اور فائیل ایک طرف رکھ کر میں نے قریب کے واش بیسن کے نل کو کھول کر اپنا چہرہ دھویا اور اپنی آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں۔ کتنے لکی ہیں۔ ہر سال سیر کو نکل جاتے ہیں اور اپنی قسمت میں لکھا ہے کُدّو بھیٹرا! نہ جانے کس طرح یہ لوگ ہر سال کسی ہل سٹیشن پر جانے کے لئے اپنی تنخواہ میں سے رقم بچا لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ بھی میری ہی طرح بیوی بچّوں والے ہیں اور ایک میں ہوں اُلّو! جو کبھی نہیں گیا کُلّو!

واپسی پر جی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی میز پر جاؤں۔ اُس سیکشن آفیسر سے مڈبھیڑ ہو گی اور ابھی اس کی داستان ختم نہیں ہوئی تھی۔ سیکشن آفیسر سے مُنہ پھیر لوں گا تو ستیہ پال نینی تال کے قصّے سُنائے گا۔ اس لئے میں اُن دونوں سے بچنے کے لئے دوسرے سیکشن میں گھس گیا۔ وہاں ایک میز پر جمگھٹا دیکھا بہت سے کلرک اور سیکشن آفیسر کھڑے تھے۔ مسٹر داؤد سپرنٹنڈنٹ سے اُس کے گُل مرگ جانے کی داستان سُن رہے تھے۔ جو بیوی بچّوں کو چھوڑ کر اکیلا گل مرگ گیا تھا۔

"پہاڑ پر جانا ہو اور چند دن لطف کے گزارنے ہوں تو بیوی بچّوں کو ساتھ لے جانا حماقت ہے۔ میں صرف بیس دن کے لئے گُل مرگ گیا تھا اور نیڈوز میں ٹھہرا تھا—" داؤد بیان کر رہا تھا۔ اور سب کلرک اور ہیڈ کلرک اور سیکشن آفیسر حیرت زدہ ہو کر اُس کی داستان سُن رہے تھے۔ گُل مرگ کی سرکلر روڈ۔ گل مرگ کا گاف کلب۔ الپتھر کی جھیل۔ گُل مرگ اور ٹن مرگ کے درمیان دیواردں

دیوداروں کے حسین جنگل! ایک ایک منظر وہ ایسی دلکشی سے بیان کر رہا تھا کہ جی چاہتا تھا اس کا گلا گھونٹ دوں۔ وہ کہنے لگا — پھر نیڈوز میں ایک مصری کیبرے گرل سے ملاقات ہو گئی۔ اُس کا نام لیلیٰ تھا اور وہ اُس کا مجنوں تھا۔ زیتونی شفاف رنگت۔ ایشیائی نزاکت اور مصری دلربائی آنکھیں ایسی کٹیلی کہ بنگالی حسینہ کے جادو کو بھی مات کریں۔ دن میں شباب کی مُنہ زور ندی چڑھی تھی اور گل مرگ کی حرارت پھولوں کی چھتری تھی راتیں لیلیٰ کی سنہری باہوں کی گداز محبت میں گزرتی تھیں اور دن کو ٹن مرگ جاتا تھا جہاں ایک کشمیری حسینہ جس کا نام فیروزہ تھا اخروٹوں کے جھنڈ تلے میرا انتظار کرتی تھی ایک دن کیا ہوا —''

میں اس کے آگے نہ سن سکا۔ اپنی میز پر واپس آگیا اور گل بھوشن کی فائیل دیکھنے لگا۔ جس میں اُس نے سکریو فیکٹری کو بڑھانے کی اجازت طلب کی تھی اور بینک کی اتھارٹی کے زور پر سرکار سے دو لاکھ کا قرضہ مانگا تھا۔ میں غور سے اس کی فائیل پڑھتا رہا۔ ایک بار پڑھی۔ دو بار پڑھی۔ سہ بار پڑھی۔ اتنے میں دفتر سے جانے کا وقت ہو گیا۔ ورنہ چوتھی بار بھی پڑھتا۔ کیونکہ میں کسی طرح نینی تال۔ کلو اور گل مرگ کے اور قصے سننے کی تاب نہ رکھتا تھا۔

گھر گیا تو گل بھوشن اپنی کار لیے کھڑا تھا۔ وہ اپنی فائیل کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے مجھے شام کی چائے اور کھانے کے لیے ''دی بلو ہیون'' میں مدعو کر لیا۔ بیوی سے اجازت لے کر میں اُس کے ساتھ ''دی بلو ہیون'' چلا گیا۔ وہاں اُس نے مجھ سے سکریو فیکٹری کو بڑھانے کے سلسلے میں اور مزید قرضہ لینے کے سلسلے میں چند ضروری سوالات کیے اور جب اُن کا تسلی بخش جواب اُسے مل گیا، تو اس نے اپنے دارجلنگ جانے کی داستان چھیڑی۔ سفید بادلوں کے مرغولوں سے اُوپر اٹھتی ہوئی کنچن جنگا کی برف پوش چوٹی اور نیچے دُھند میں گھری وادیوں کے نیم شفاف سینے اور سہ پہر ڈھلنے کے بعد غروبِ آفتاب کے دل افروز منظر کی ایسی تصویر

کھینچی کہ میرا دل اس دن کنچن جنگا جانے کے لئے بے تاب ہونے لگا۔

وہ کہہ رہا تھا ــ ”بھوٹیا عورتوں کا حسن۔ بلاشبہ آریائی خد و خال سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اُن کی اپنی شانِ دلربائی ہے۔ کان کی لو تک کھینچی ہوئی نیم باز آنکھوں کی کجرائی ہوئی کیفیت دل کو گرویدہ بنالیتی ہے۔ وہاں مجھے ایک بھوٹیا لڑکی ملی۔ ایک تبتی حسینہ ایمنا گونش جس کے بال اس کے ٹخنوں تک آتے تھے اور جو روبندر سنگیت شام کی حسین تنہائی میں پھولوں کے ایک کنج میں بیٹھے ہوئے . . .“

میں دیر تک کُل بھوشن کے رومان اور مردانگی کی داستانیں سنتا رہا۔ کوئی ہل سٹیشن ایسا نہ تھا جہاں وہ گیا نہ تھا۔ جہاں اُسے کوئی نہ کوئی حسین لڑکی نہ ملی تھی۔ میں نے اس لئے بھی اس کی باتیں غور سے سنیں کہ اس نے مجھے ”دی بلو ہیون“ میں کھانے کی دعوت دی تھی۔ جہاں ایک آدمی کا بل پچاس روپے سے کم نہیں ہوتا ہے! اور پھر اس نے مجھے اپنی فائل آگے بڑھانے کے لئے تین سو روپے بھی دیئے تھے جس میں سے میرے بڑے لڑکے کے کالج کی فیس دی جا سکتی تھی۔ اس لئے میں غور سے اس کی داستانیں سنتا رہا اور کُڑھتا رہا۔ اور جلتا رہا۔

چند دنوں کے بعد میں اپنے دوست پریش گھورا سے ملنے گیا۔ جو سیلز ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں سیکشن آفیسر ہے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے ذکر کیا۔ ”تم کیا کسی ہل سٹیشن گئے ہو؟“

وہ بولا: ”ارے بھئی دو وقت کی روٹی اور بچوں کی فیس نکل جائے اس تنخواہ میں سے تو بہت ہے۔ ہل سٹیشن کا نام لے کر میرا جی بُرا کیوں کرتے ہو!“

”پھر یہ ستیہ پال اور داؤد صاحب نینی تال اور کلّو اور گلمرگ کیسے ہو آتے ہیں؟“

”کون ستیہ پال؟“ ہریش گھورا ایک دم بھڑک کر بولا۔ ”تمہارے دفتر والا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ وہی!“

گزشتہ چھٹیوں میں وہ تو اپنے گودھرا میں تھا۔ ہم دونوں نے چھٹیاں ساتھ گزاریں۔ کیونکہ ہم دونوں گودھرا کے رہنے والے ہیں اور اتفاق سے ہم دونوں نے چند دنوں کے وقفے سے ایک ہی وقت میں چھٹی لی تھی اور داؤد بے چارہ تو ناڈیاڈ کی تنگ میلی کچیلی بدبودار گلیوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ کیونکہ مجھے ایک ضروری کام سے گودھرا سے ناڈیاڈ جانا پڑا تھا۔ ایک ہفتے کے لئے گیا تھا اور داؤد ہی کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا۔‘‘

ہرلش کپور زور زور سے ہنسنے لگا۔ یکایک سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔

دوسرے سال دس دن کے بجائے میں نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے کر اپنے گددھیڑا چلا گیا۔ وہاں آرام سے تیس دن رہ کر جو اپنے دفتر لوٹا تو دفتر میں میری لمبی چھٹی کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ کیونکہ جب سے میں دفتر میں ملازم ہوا تھا۔ میں نے کبھی ہفتے یا دس دن سے زیادہ کی چھٹی نہیں لی تھی۔ اس دوران میں سنیہہ پال اوٹاکمنڈ سے واپس آچکا تھا۔ اور داؤد نے تین ہفتے شملے میں گزارے تھے اور میرا جانی جگری دوست کھٹمنڈو تک ہو آیا تھا اور نیپالی حسن کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اتنی لمبی چھٹی کیوں لی تم نے ؟‘‘

میں نے کہا ’’میرے چچا کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ لاولد مرے۔ اس لئے کریا کرم مجھے کرنا پڑا۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے۔‘‘ ایک سیکشن آفیسر بولا ’’لیکن ایک ماہ کیا کرتے رہے ؟‘‘

میں نے آہستہ سے اور مکمل بے پروائی سے جواب دیا ’’پیرس میں چلا گیا تھا۔‘‘

’’پیرس!‘‘ ایک دم بہت سے کلرک اور سیکشن آفیسر اور دوسرے لوگ چیخ پڑے ’’تم ایک دم پیرس کیسے پہنچ گئے ـــ ؟‘‘

میں نے کہا ’’مرتے ہوئے چچا نے اپنی وصیت میں ساری جائیداد میرے نام چھوڑی۔ بینک

میں بیس ہزار روپیہ بھی تھا۔ میں اُسے نکلوا کے سیدھا پیرس چلا گیا۔" سنتیہ پال کو ابھی تک یقین نہ آرہا تھا۔ وہ مشتبہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پیرس میں تم نے کیا دیکھا ——؟"

اب میرے شروع ہونے کی باری تھی۔ ایک سال سے میں اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ پورا ایک ماہ میں نے اپنے گاؤں کدو دھیڑا میں کدو کھانے اور پیرس کے متعلق ہر طرح کا لٹریچر پڑھنے اور اس کی تصویریں دیکھنے میں صرف کیا تھا۔ پیرس کا نقشہ مجھے اپنی ہتھیلی کی طرح نظر آرہا تھا۔

"سب سے پہلے تو میں نے نالیز برژرے دیکھا" میں کہنے لگا۔ بہترین عریاں کیبرے۔ کیا عورتیں ہیں۔ کیا سجاوٹ؟ کیا جسم ہیں اُن کے جیسے گلابی مخمل! ہاتھ پھیر دو تو پھسلتا ہی جائے۔ پھر لیبڈو کا نائٹ کلب دیکھا، وہ نالیز برژرے سے بھی زیادہ پسند آیا۔ اور ایفل ٹاور کا تو جواب نہیں ہے۔

اور بے سٹیل۔ ناتردیم اور لوُوڈ۔ لیڈو میں ایک ہسپینی حسینہ سے ملاقات ہوئی۔ چاندنی راتوں میں ہم دریائے سین میں کشتی چلاتے تھے۔ پیار کے آداب تو کچھ ہسپینی حسینائیں ہی جانتی ہیں۔ تیز شباب حدت افروز جذبے کی گرمی سے لبریز ہاتھ چھونے سے جسم میں بجلی دوڑنے لگتی ہے۔ آہ سوزنا ..... تجھے کبھی بھول نہ سکوں گا.....

"کیا وہ پیرس میں رہتی ہے؟" داؤد نے بیزار ہو کر پوچھا۔

"نہیں میری طرح وہ بھی پیرس کی سیر کرنے آئی تھی۔ دراصل وہ مکمل ہسپینی نہیں ہے۔ لاطینی اور ہسپینی حُسن کا امتزاج ہے۔

ریُوڈی جینرو میں رہتی ہے۔ اُس کا شوہر کروڑ پتی ہے۔ بہت بڑا بزنس ہے اس کا۔ کافی کے باغات ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا.... مگر وہ مجھ سے بے حد محبت کرنے لگی ہے۔ میری سوزنا۔ سویٹ ہارٹ ...."

میں سینے پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گیا۔

”تو کیا وہ ہندوستان آنے والی ہے؟“ داؤد نے جل کر مجھ سے پوچھا۔

”نہیں.... اگلے سال میں ریوڈی جینرو جاؤں گا۔ اس نے مجھے بلایا ہے..... ریو... ار ..... ریو.....“

میں خوابوں میں گھر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجمع چھٹ چکا تھا۔ ہر شخص سر جھکائے اپنی ٹیبل پر کام کر رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ چور نگاہوں سے مجھے دیکھ لیتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے سینے سے ایک آہ نکل جاتی تھی۔

اُس دن کے بعد کسی نے مجھ سے اپنی سیر و سیاحت کا تذکرہ نہیں کیا۔

کاغذ کا رشتہ

کیقباد ایرانی، مشہد سے اپنی تیسری بیوی بیاہ کے لایا تھا۔ وہ بڑی خوبصورت اور نازک اندام لڑکی تھی۔ کیقباد اسے بہت چاہتا تھا۔ مگر اس لڑکی میں ایک نقص تھا۔ رات کو جب کیقباد ریستوران بند کرکے گھر جاتا تو وہ دن بھر کی کمائی دھروا لیتی۔

کچھ عرصہ تک کیقباد خوشی خوشی دیتا رہا پوری کمائی۔ پھر اسے کھلنے لگا۔ یہ کیا حرکت ہے۔ آخر دنیا میں اور بھی تو بہت سی ضرورتیں ہیں جنہیں پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ سوچ کر وہ گول مال کرنے لگا۔ کیوں کہ اسے اپنی تیسری بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس لئے اب وہ روز کی کمائی میں سے پچاس فیصد نکال کے لے جاتا۔ باقی رقم گلّے میں رکھی رہنے دیتا۔ جسے وہ اگلے دن بنک بھجوا دیتا۔ مشہد کی حسینہ نے چند روز تو رقم کے کم ہونے پر اعتراض کیا۔ مگر جب ایرانی نے زمانے کی ہوشربا گرانی کا ذکر کیا تو وہ قائل ہو گئی۔ اسے یقین آگیا کہ ایرانی اب بھی اسے پوری رقم لا کے دیتا ہے۔

آج بھی کیقباد ریستوران بند کر کے گلے سے دو سو روپے نکال کے چلا گیا۔ سوا دو سو کے قریب اس نے کونٹر کی دراز میں رکھ کر اسے تالا لگا دیا۔ اور ریستوران کے باہر رُکنے والی بس پکڑ کے گھر چلا گیا۔

اس کے جانے کے کوئی تین گھنٹے کے بعد دو چوروں نے سمندر کی طرف سے ریستوران کا عقبی دروازہ توڑ کے نقب لگائی.... یہ مونو اور سونو تھے۔ دونوں چچازاد بھائی تھے، اور مل کر نقب لگاتے تھے۔ تجربے نے انہیں بتایا تھا کہ اس طرح نقب لگانے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ ایک کمند لگاتا ہے دوسرا اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے۔ اندر پہنچ کر مال اکٹھا کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ اگر عین موقع پر پکڑے جائیں تو مقابلہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ مونو اور سونو کا شمار شہر کے کامیاب ترین چوروں میں ہوتا تھا۔

ریستوران کے اندر پہنچ کر سب سے پہلے تو انہوں نے گلّہ توڑ کر اُس میں سے سوا دو سو روپے اور کچھ نقدی سمیٹ لی۔ مگر اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو سونو بولا ـــ

"مجھے تو بھوک لگی ہے۔"

"آئس کریم کھا لو؟" ـــ مونو بولا

"یہ آئس کریم والی بھوک نہیں ہے۔"

سونو نے اتنا کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ٹین کے ایک لمبے بکسے پر بریٹنیا لکھا تھا۔ انہوں نے بکسا کھول کر اس میں سے بریٹنیا کی دو ڈبل روٹیاں نکال لیں۔ فریڈر کھول کر پولسن کا مکھن نکالا۔ خوبانی کے جیم کا ایک ڈبہ کھولا، اور ڈبل روٹی پر مکھن اور جیم لگا کر کھانے لگے۔ مونو بولا ـــ "مزہ نہیں آ رہا ہے!"

"تو چار انڈوں کا ایک آملیٹ بنا دو۔ آدھا آدھا بانٹ کر کھا لیں گے!"

سونو نے فرجڈیر سے چار انڈے نکالے۔ کچن میں جا کے باقی سامان اِدھر اُدھر سے ڈھونڈ کے گیس پر چار انڈوں کا ایک لذیذ آملیٹ فرائی کیا...... اب کچن میں آ گئے تھے تو چائے بھی بنا ڈالی۔ اور پھر سارا سامان باہر ایک میز پر رکھ کر اور کُرسیوں پر بیٹھ کر شریف گاہکوں کی طرح کھانے لگے۔

یکایک الماری کے پیچھے سے کھڑکا ہوا۔ مونو اور سونو دونوں دم بخود ہو گئے۔ چلتے ہوئے جبڑے رُک گئے۔ لقمہ حلق ہی میں رہ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے دونوں نے اپنی جیب سے چاقو نکال لئے۔

دوسرا کھڑکا ہوا، کوئی ایک دم اچھل کر ان کے سامنے آ رہا ـــ

”میاؤں!“

ایک نہایت پیاری ایرانی بلّی تھی۔ اپنی خوبصورت آنکھیں اُوپر اٹھائے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بلّی کو دیکھ کر مونو اور سونو کی جان میں جان آئی۔ دونوں نے چاقو تہہ کر کے جیب میں رکھے۔ روٹی کے ٹکڑے چائے میں بھگو بھگو کے کھانے لگے۔ اور چُورا بلّی کو ڈالنے لگے۔ بلّی نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ ایرانی بلّی تھی، کوڑا کرکٹ نہیں کھاتی تھی۔

”میاؤں!“

”اپنا حصّہ مانگتی ہے“ ـــ مونو ہنسا۔

سونو نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر اُسے فرش پر رکھ دیا۔ بلّی چپ چپ کر کے دودھ پینے لگی۔ اور جب دودھ پی چکی تو اچک کر سونو کی گود میں آ رہی۔ سونو پیار سے اس کی نرم نرم سمور پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ بولا ـــ ”بڑی پیاری بلّی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے بھی جھولے میں ڈال کر لے چلوں۔“

"اٹھو اب!" — مونو نے چائے ختم کر کے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو نا" — سونو نے آہستہ سے بلّی کو فرش پر چھوڑ کے کہا — "بچوں کے لئے ٹانی کا ایک ڈبہ تو لے لوں!"

سونو نے ٹانی کا ایک ڈبہ لے کر جھولے میں ڈالا۔ مونو نے برٹینیا کا ایک ڈبہ جھولے میں ڈالا۔ بولا ——

"اب چلو!"

دونوں چلے ——

"ٹھہرو!" — سونو بولا — "کیسے عمدہ عمدہ سگریٹ یہاں رکھے ہیں!"

سونو نے اسٹیفان کنگ کے سگریٹوں کا انتخاب کیا۔ ایک ڈبہ جھولے میں ڈالا۔ مونو نے نائن نائن نائن (۹۹۹) کے سگریٹ پسند کئے۔

"اب واقعی چلے چلو۔ زیادہ لالچ کرنا ٹھیک نہیں ہے" — مونو نے کہا۔

دونوں چلے۔ چلتے چلتے سونو کاسمیٹک (ہار سنگھار) کی الماری کے سامنے رک گیا ——

"گھر والی کے لئے بھی تو کچھ لے کر چلنا چاہیئے!"

سونو نے اپنی گھر والی کے لئے ایک فرنچ عطر کی شیشی لی۔ مونو نے آدھی درجن لپ اسٹک جھولے میں رکھی۔ اور ایک یوڈی کلون کی شیشی پھر سلور جلٹ کے دو پیکٹ۔

"سالا ہندوستانی بلیڈ کسی کام کا نہیں ہوتا!"

"نہیں، اب تو بہتر بننے لگے ہیں!" — سونو بولا — "دھیرے دھیرے ملک ترقی کرتا ہے۔ امریکہ کو دیکھو، سو برس لگے ہیں۔ روس کو پچاس برس لگے ہیں!"

سونو میٹرک فیل تھا۔ مونو کو صرف تین کلاس پڑھ کر اسکول سے اٹھ جانا پڑا تھا۔ اس لئے

دونوں میں سونو ہی دانشور مانا جاتا تھا۔ مونو کو سونو کی یہی باتیں کھلتی تھیں۔

"اچھا اب زیادہ قابلیت مت بگھارو۔ اور فوراً باہر نکل چلو!" وہ بولا "اگر کسی نے دیکھ لیا تو امریکہ اور روس دونوں بھول جاؤ گے۔ سیدھے جیل جاؤ گے!"

سونو مونو کے پیچھے پیچھے چلتا اُس دیوار کے قریب آگیا جس کے روشن دانوں سے رسّی ابھی تک بندھی ہوئی دیوار سے لگی لگی ہل رہی تھی۔ روشن دان کی دیوار سے ملحق کیقباد ایرانی نے اپنے ملک کے بڑے بڑے آدمیوں کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ اور ان کی بغل میں بڑے بڑے ہندوستانی اور بین الاقوامی نیتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔

سونو نے ان کی طرف نگاہ ڈال کے ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

"اگر میں چور نہ ہوتا تو اپنے ملک کا بہت بڑا نیتا ہوتا۔"

مونو کو سونو کی کمزوری معلوم تھی۔ سونو پالیٹکس پر گفتگو کرنا بہت پسند کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے اس وقت سونو کو کوئی جواب دیا تو بحث اُلجھ جائے گی، اور صبح ہو جائے گی۔ اس لئے وہ خاموش رہ کر اس کے سہارے دیوار سے پیر ٹکائے اوپر چڑھنے...... روشن دان پر پاؤں ٹکائے اس نے سونو کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ سونو روشن دان تک آیا۔ اور ایک چالاک بلّی کی طرح روشن دان کے فریم کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پاؤں دیوار سے چپکا کر لٹک گیا۔ رسّی اوپر کھینچ کر مونو نے اُسے روشن دان سے باہر پھینک دیا۔ اور اسی رسّی کے سہارے سمندر کے کنارے چلا گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے سونو بھی۔ دونوں جلدی سے دیکھتے بھاگتے سمندری چٹانوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ اور ان کی اوٹ میں بھاگتے بھاگتے ڈانڈے کے ساحل کے قریب پہنچ گئے۔

اب وہ نقب لگنے والی جگہ سے تقریباً ایک میل کی دوری پر تھے۔ سونو نے گھڑی دیکھی۔

تین بج رہے تھے۔

"چار بجے پولیس کی پٹرول آئے گی!"

"بہت وقت ہے!"

"تو آؤ مال بانٹ لیں!"

دونوں نے اپنے اپنے حصے کے سگریٹ، ٹافیاں، بسکٹ، لپ اسٹک، سینٹ الگ الگ کر لئے۔ پھر نقدی کی باری آئی۔ وہ بھی دونوں نے برابر بانٹ لی۔ پھر نوٹوں کی باری آئی، وہ بھی دونوں نے برابر بانٹ لی۔ آخری دس کا ایک گندہ میلا نوٹ مولو کے حصّے میں آیا۔ مولو چوں کہ کم پڑھا لکھا تھا، اس نے اُسے دیکھ جھنجھلا گیا۔ وہ نوٹ سولو کو واپس کرتے ہوئے بولا ——

"یہ نوٹ تم رکھ لو، مجھے کوئی دوسرا دے دو!"

"کیوں دے دوں؟ کیا یہ دس کا نوٹ نہیں ہے؟"

"نوٹ تو ہے، اس لئے تو کہتا ہوں کوئی دوسرا دے دو!"

"کیوں دے دوں؟ تم کو یہی لینا پڑے گا۔!"

"لینا پڑے گا، کیا مطلب؟ — یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ نوٹ بہت خستہ اور مَیلا ہے، اور تم بانٹ رہے ہو اور تم جان بوجھ کر یہ نوٹ مجھے چپکانا چاہتے ہو!"

"جان بوجھ کے! تمہارا مطلب ہے تمہارے ساتھ بے ایمانی کرنا چاہتا ہوں؟"

"کھلی بے ایمانی!" — سولو غصّے سے بولا — "آج میں نے کمند لگائی تھی۔ حساب سے جو کمند لگاتا ہے اُسے حصہ زیادہ ملنا ہے میں اس پر بھی چپ ہوں پر تم بے ایمانی کئے جا رہے ہو!"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔ پچھلی چوری میں میں نے کمند لگائی تھی۔ بھول گئے؟"

"تو تم نے پانچ روپے بھی تو زیادہ لئے تھے۔"

"تو آج تم بھی لے لو یہ پانچ روپے، اور بک بک بند کرو!"

"میں بک بک کرتا ہوں!" ـــ سونو کے سارے جسم میں غصّے کی پھریریاں دوڑنے لگیں۔

"میں نہیں لینا یہ پانچ روپے سمجھے، دس کا نوٹ بدل کے دو!"

"نہیں بدلا جائے گا.....!" سونو نے طیش میں آکے کہا۔ اس کی آنکھوں کے آگے چنگاریاں ناچنے لگی تھیں ـــ "ہاں، نہیں بدلا جائے گا۔"

سونو نے چاقو نکال لیا ـــ

پھر مونو نے بھی!

پونے چھ کے قریب جب پولیس کی گارد ساحل ساحل گشت کرتی ڈانڈے پہنچی تو اُسے چٹانوں کے عقب میں دو لاشیں ملیں۔ ریت پر کافی دُور تک دھینگا مُشتی کے نشان تھے۔ اور لہو کی بھوری دھاریں ان کے جسموں سے نکل کر ریت میں جذب ہو کر خشک ہو چلی تھیں۔ مونو کا چاقو سونو کے دل میں گھس گیا تھا، اور سونو نے مونو کا حلق کاٹ ڈالا تھا۔

پولیس دونوں لاشیں اٹھوا کر تھانے لے گئی، اور دونوں کا سامان اور روپیہ بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا ـــ کیقباد بہت خوش قسمت تھا۔ اُسے پوری رقم مل گئی اور چوری کا سامان بھی۔ ایک لپ اسٹک تک غائب نہیں ہوا تھا۔

پولیس انسپکٹر سبط حسن نے دونوں لاشوں کو فوراً شناخت کر لیا۔ کیوں کہ مونو سونو دونوں کے فوٹو تھانے میں موجود تھے۔ دونوں کئی بار سزا کاٹ چکے تھے۔

"ارے! یہ تو مونو سونو ہیں!!" ـــ سب انسپکٹر ڈکٹے حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ہاں!" ـــ سبطِ حسن انسپکٹر نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکال کے نسوار کی ایک چُٹکی بھری ـــ

”شاید نوٹوں کی تقسیم پر لڑے ہوں گے!“

”پر.... پر....“ کمٹے نے حیرت سے لاشوں کی طرف دیکھا۔ پھر انسپکٹر کی طرف مڑ کے بولا۔

”یہ دونوں تو چچا زاد بھائی تھے —!“

سبطِ حسن نے کمالِ مشاقی سے اپنے دونوں نتھنوں میں نسوار بھری۔ اور بڑی بیزاری سے بولا۔

”ارے کاہے کے بھائی!.... کس کا باپ؟.... اور کون بیٹا؟.... آج کل جتنے رشتے ہیں، سب کاغذ کے ہیں!“

اتنا کہہ کر اس نے زور سے چھینک لی—

برہمن

پٹوردھن نے ممتاز کی لاش کو گھسیٹ کر پریل اور دادر کے درمیانی چوک کے ایک بڑے مین ہول کے پاس رکھا جو کالٹکس پٹرول پمپ کے سامنے سڑک میں تھا اور پھر اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ ممتاز کی لاش کو گھسیٹ کر مین ہول کے پاس رکھ رہا تھا تو اکا دکا راہ گیر جو ابھی تک سڑک پر چل رہے تھے خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں بھاگ گئے۔ نکڑ کے ایرانی نے اندر سے اپنی دوکان بند کر لی۔ پھول والے پان والے اور تنبولی اپنی اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ تھوڑی دیر میں سڑک پر سناٹا ہو گیا۔ سامنے میونسپل کمیٹی کے بھنگیوں کی کھولیاں تھیں جن کے باہر ننگ دھڑنگ بچے اکثر کھیلا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ان کی معصوم آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس علاقے کی روح اپنے منہ پر ہات رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈری ہوئی، سہمی ہوئی، مین ہول کے کنارے

چپ چاپ کھڑی ہے۔

پٹوردھن نے ممتاز کے سیاہ گنگریالے بالوں کو زور سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے اس کے چہرے کو اپنے سامنے لایا۔ ممتاز کے چہرے پر کسی کرب کا نشان نہ تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کا گورا چہرہ خوب صورت نہ تھا مگر مضبوط ضرور تھا۔ اس کے چہرے سے مضبوطی کے ساتھ ایک عجیب قسم کی ہیکڑی اور رعب کا انداز مترشح تھا۔ پٹوردھن کو اس کے چہرے پر موت کے بعد بھی استہزا کا شائبہ سا نظر آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ممتاز مرنے کے بعد بھی اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ اور اس نے ممتاز کے بالوں کو جھٹکے دے کر اس کے چہرے کو سڑک کے سخت فرش پر ٹپکا۔ جب اس سے اس کی تسلی نہ ہوئی تو وہ کالٹکس پٹرول پمپ کے اندر چلا گیا۔ اور خوف زدہ بنیے سے جیک مانگ لایا۔ دو تین بار زور زور سے لوہے کے جیک کو ممتاز کے منہ پر مارا۔ ممتاز کے جبڑے ٹوٹ گئے۔ اس کے دانت باہر نکل آئے۔ پٹوردھن کو معلوم ہوا جیسے ممتاز ابھی تک اس پر ہنس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے۔ اس نے تین چار بار جیک اس کے سر پر مارا اور پھر لاش کا سر قلم کرنے کے لئے اپنا تیز ٹکوا اٹھایا۔

ممتاز اور پٹوردھن دونوں دادر مین روڈ کے غنڈے تھے۔ لیکن جب تک ممتاز زندہ رہا پٹوردھن دادر کا نمبر دو موالی ہی سمجھا جاتا رہا۔ سیٹھ سورج بل جس کی دادر مین روڈ اور آس پاس کی گلیوں میں بہت سی بلڈنگیں تھیں اور سیٹھ تردیدی لال جس کے دادر میں تین فلم سٹوڈیو تھے دونوں ممتاز کی زیادہ عزت کرتے تھے۔ سیٹھ تردیدی لال نے اپنی تمام فلموں میں اکسٹرا بھرتی کرنے کا ٹھیکہ ممتاز کو دے رکھا تھا۔ صرف چند چھوٹی چھوٹی فلم کمپنیوں والے ہی بڑی مشکل سے پٹوردھن کو کام دیتے تھے۔ دادر بازار کی مسجد سے لے کر پریل کے نالے تک ممتاز کا راج تھا اور مسجد سے ادھر دادر اور جی پی آئی سٹیشن تک اور ادھر چھوٹے بازار میں جو گھوم کر

خداداد سرکل میں جانکلتا ہے۔ پٹوردھن کا راج تھا۔ مگر دونوں اکثر ایک دوسرے کے علاقے میں چھاپا مارا کرتے۔ پٹوردھن کم مگر ممتاز زیادہ دلیری اور جی داری سے چھاپے مارتا اور کبھی تو علی الاعلان پٹوردھن کے علاقے میں گھس کے اس کے غنڈوں کو پیٹ دیا کرتا۔ ممتاز کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ کسرتی گورا بدن۔ جہلم کا رہنے والا اور بڑا ہتھ چھٹا اور گالیاں بکنے والا تھا۔ اس کے برخلاف پٹوردھن بڑا متین صورت اور گھنا تھا۔ اس کا قد ناٹا تھا اور رنگ سیاہ لیکن آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کے سیاہ چہرے پر نیلی آنکھیں اس کے چہرے کو عجیب وحشتناک بنا دیتی تھیں۔ جب وہ اپنی وحشت ناک نیلی نیلی آنکھوں سے گھور کے دیکھتا اور دبی زبان میں دھمکی دیتا تو اس کی دھمکی کا پر امن شہریوں پر فوری اثر ہوتا تھا۔ مگر ممتاز کے سامنے اس کی کور ہمیشہ دبی تھی۔ کئی بار ممتاز اور پٹوردھن کے غنڈوں میں لڑائی ہوئی، کئی غنڈے مارے بھی گئے، جیل بھی گئے لیکن ممتاز اور پٹوردھن کی دوبدو لڑائی ابھی تک نہ ہوئی تھی، کئی بار غصے میں آکر ممتاز نے پٹوردھن کو للکارا بھی تھا۔ بلکہ ایک بار سر بازار اسے گردن سے پکڑ کر اس کے بازوؤں کو یوں مروڑ دیا تھا کہ پٹوردھن کا تیز لہلہاتا ہوا چاقو جو شاید دوسرے لمحے ممتاز کی آنتیں چیر دیتا، زمین پر گر گیا اور پٹوردھن نہتا ہو کر بے بس اور مجبور ہو کر ممتاز کے ہاتھوں میں بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔

اس لمحے کی رسوائی کا خیال آتے ہی اب گویا پٹوردھن پر بخار کی ہزیانی کیفیت طاری ہو گئی اس نے ٹکڑے کو اوپر ہوا میں اٹھایا اور پے در پے وار کر کے اس نے لاش کو دھڑ سے کاٹ دیا اور دھڑ کا نیچے کا حصہ مین ہول میں گرا دیا۔

دور آسمان پر ایک چیل بڑی بے صبری سے چلائی۔ بجلی کے تاروں سے الجھتی ہوئی ایک خالی ٹرام ناکے پر سے گزر گئی۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

یکایک پٹوردھن کی نظر ممتاز کے دائیں ہات پر پڑی۔ اس ہات پر انگریزی میں ایک نام

کھدا تھا "مایا"، مایا اکسٹرا لڑکیوں میں حسین ترین مانی جاتی تھی۔ اسے رقص کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر سبز ساڑی میں ملبوس نظر آتی تھی۔ لوگ اکثر اسے مورنی کہتے تھے۔ پٹوردھن کو اس کی ہنسی بہت پسند تھی اور اس کی ٹھوڑی جس میں ایک سبز بندی کھدی ہوئی تھی اور جب وہ ہنستی تھی تو سبز بندی کے قریب ایک عجیب سا خم پڑتا تھا۔ جسے دیکھ کر پٹوردھن پاگل ہو جاتا تھا۔ مایا گاؤں سے آئی تھی اس لئے فلم میں کام کرنے کے باوجود ابھی تک اس کی شخصیت میں دیہاتنوں کا سا الہڑپنا تھا۔ اور بے باک صاف گوئی کی جھلک ملتی تھی۔ اگرچہ وہ پٹوردھن ہی کے ٹولے میں تھی، مرہٹی لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کا سب سے پہلے پٹوردھن کے ٹولے میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، لیکن ہزار کوشش کے باوجود وہ اب تک اس کے ہتھے نہ چڑھی تھی۔

پٹوردھن نے مایا کو اپنے قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ کسی غنڈے کے لئے اس سے بڑی بے عزتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عورت کے لئے چند مہینوں کے لئے یا چند دنوں کے لئے شریف بن جائے۔ مگر پٹوردھن نے مایا کو حاصل کرنے کے لئے یہ بے عزتی بھی گوارا کی تھی۔ اسے آفتاب محل سٹوڈیو کی گلی میں ایک صاف ستھری کھولی رہنے کو دی تھی۔ فرنیچر مہیا کیا تھا۔ جب فلم کمپنی سے پیسے وصول ہوتے تو وہ پیسے لے کر سب سے پہلے مایا کے گھر جاتا۔ مایا پیسے لے کر شریر نگاہوں سے اس کی طرف تاکتی۔ مورنی کی طرح رقص کا ایک چکر اس کے گرد کاٹتی۔ اس کے شانوں کو اپنی حساس انگلیوں سے چھوتی۔ پٹوردھن کی آنکھوں میں نشہ سا اترنے لگتا۔ اور وہ چپ چاپ مجبور ہو کر کھولی سے باہر نکل آتا۔ آج تک کسی عورت نے اسے مات نہ دی تھی۔ یہ نہیں کہ اسے مایا سے محبت تھی۔ پٹوردھن کو، جب سے اس نے ہوش سنبھالا، آج تک کسی سے محبت نہ ہوئی تھی۔ مایا سے بھی محبت نہ تھی۔ وہ تو اسے جیتنا چاہتا تھا جیسے آدمی شطرنج کی بازی جیتتا ہے اور اپنی فکر اور عمل کا سارا زور اسے جیتنے میں صرف کر دیتا ہے۔ یہی پٹوردھن کی حالت ہے۔

اسی روز اسے بہت غصہ آیا جب اس نے دیکھا کہ علی بخش گودنے والے کی دکان پر ممتاز کھڑا اپنی بانہہ پر "مایا" کا نام کھدوا رہا ہے اور مایا کے نام کے اوپر اپنا نام یعنی ممتاز کھدوا رہا ہے۔ ایک چیخ مار کر اس نے ممتاز پر اپنے چاقو کا حملہ کرنا چاہا مگر ممتاز کے غنڈوں نے جو سائے کی طرح اپنے مالک کے ساتھ لگے ہوئے تھے اسے رستے ہی میں دبوچ لیا۔ پھر دونوں طرف کے غنڈوں میں وہ لڑائی ہوئی ہے وہ لڑائی ہوئی ہے کہ سوڈا واٹر بیچنے والوں کی بوتلیں پھوٹ گئیں، آم بیچنے والوں کے آم سڑک پر لڑھک گئے۔ اور پرانے جوتے بیچنے والی غریب عورتوں کے جوتے بازار کی موری میں بہہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی اور چند غنڈوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ممتاز مسکراتا ہوا علی بخش کی دکان پر اپنی بانہہ گدواتا رہا۔ اسی رات ممتاز مایا کو اس کی کھولی سے اٹھا لے گیا۔ مایا بہت چیخی چلائی مگر بلڈنگ والے سب ممتاز کو جانتے تھے کہ وہ کیسا خوفناک آدمی ہے۔ ممتاز اپنے طاقتور بازوؤں میں مایا کو اٹھا کے لے گیا۔ اور کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ اس کے راستے میں آئے اور جب ہٹور دھن کو خبر ملی۔ اس وقت ممتاز اپنے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ ممتاز نے مایا کو سیٹھ سورج مل کی بلڈنگ نمبر سات میں رکھا جہاں اس نے پہلے ہی سے اپنے بہت سے موالی بھر رکھے تھے۔

ہٹور دھن دانت پیس کر رہ گیا۔ مگر اس نے آس نہیں چھوڑی۔ اس نے علاقے میں ہندو مسلم سوال کھڑا کرنا چاہا۔ علاقے کے بڑے بڑے سیٹھ سب ممتاز کے حامی تھے۔ اس لئے کسی نے اس سوال کو ہندو مسلم سوال بننے نہ دیا۔ ممتاز سیٹھوں کی بلڈنگوں کا کرایہ بڑی خوش اسلوبی سے وصول کرتا تھا۔ فلم اکسٹرا لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے رکھتا تھا۔ ان سے کم سے کم بھاؤ میں کام کروا کے سیٹھوں کو خوش رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ موقع بے موقع ضرورت پڑنے پر سود خور پٹھانوں سے فلم کمپنیوں کو قرضہ بھی دلوا دیتا تھا۔ سیٹھ لوگ ایسے کارآمد آدمی کو جیل بھیجنے کے لئے قطعی تیار

نہیں تھے اس لئے بٹور دھن اور اس کے حواریوں اور چند ہندو مہاسبھائی دکانداروں کی کوششوں کے باوجود مایا کا اغوا ہندو مسلم سوال نہ بن سکا۔ وادر کی مسجد میں چند روز نمازی بڑی مسرت سے اس کارِ خیر کا ذکر کرتے رہے مگر مایا کوئی ایسی مٹھائی تو نہ تھی جو ان میں بھی بانٹی گئی ہو اس لئے چند دنوں میں مسرت سرد مہری میں تبدیل ہو گئی۔ تھوڑے دن اور گزرنے کے بعد لوگ اس واقع کو بھول گئے۔

لیکن بٹور دھن نہیں بھولا۔ ایک رات اس نے بھی بلڈنگ نمبر سات پر جوابی حملہ کر دیا حملہ غیر متوقع اور اچانک تھا۔ بٹور دھن اپنے حواریوں کو لے کر بلڈنگ کے اندر گھس آیا اور دراتے ہوئے سیدھے مایا کی کھولی کے اندر آگیا اس وقت ممتاز اپنی بنیان اتارے ایک ریشمی لاچا پہنے کھٹیا پر بیٹھا تھا اور مایا اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

مایا کو ممتاز کے پاؤں دباتے دیکھ کر بٹور دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ ممتاز تیری بلڈنگ کا باہر سے آدمیوں نے ناکہ بند کر دیا ہے۔ تیرے پاس دس آدمی ہوں گے تو میرے پاس پچاس ہیں۔

پھر؟ ممتاز نے وہیں کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے بڑی نخوت سے کہا۔

آج میں مایا کو لینے آیا ہوں اور اسے لے کر ہی جاؤں گا۔

لے جا اگر یہ تیرے ساتھ جاتی ہے۔ ممتاز نے بڑی نرمی سے کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں عورتوں کے لئے نہیں لڑتا۔

ممتاز نے اتنا کہہ کے اپنے ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے۔

بٹور دھن حیران ہو گیا بولا۔ تجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

خدا رسول کی قسم۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

تو چل مایا۔ پٹوردھن نے مایا سے کہا۔

مایا چپ بیٹھی ممتاز کے پاؤں دباتی رہی۔

کیا تو مسلمان ہو گئی ہے۔ پٹوردھن نے بڑے غصّے سے پوچھا۔

نہیں میں ہندو ہوں۔ مایا نے جواب دیا۔

تو پھر اُٹھ، کیا سوچ رہی ہے۔ میں تجھے آزاد کرانے آیا ہوں۔

مایا چپ بیٹھی ممتاز کے پاؤں دباتی رہی۔

تو جانتی ہے تو کس سے محبت کرتی ہے؟

ایک مسلمان سے۔ مایا نے جواب دیا۔

پٹوردھن نے بڑے کڑوے لہجے میں کہا۔ اس نے سات عورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ میں سب کو جانتا ہوں۔ چاہو تو میرے ساتھ چلو ایک ایک سے پچھوائے دیتا ہوں ایسے بدمعاش آدمی کے ساتھ تو رہے گی تو برباد ہو جائے گی۔ میں تجھے عزت دیتا ہوں شادی کر کے رکھتا ہوں مایا۔ مایا بول۔ تیرا کیا جواب ہے۔

مایا بہت آہستہ سے اُٹھی۔ دبے پاؤں سر جھکائے پٹوردھن کے سامنے گئی۔ سامنے جا کے اس نے آہستہ سے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور پٹوردھن کی طرف دیکھ کر اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

پٹوردھن نے اپنا خنجر نکالا ممتاز بجلی کی طرح لپک کے بیچ میں آگیا خنجر کا پھل ممتاز کے شانے میں کھب گیا اس نے آہستہ سے خنجر اپنے شانے سے نکالا۔ دانت پیس کر بولا۔ خدا رسول کی قسم کھا چکا ہوں اس لئے مایا کے لئے تم سے نہیں لڑوں گا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ بلڈنگ سے نیچے اُتر جاؤ۔

پٹوردھن جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس نے کنکھیوں سے کھڑکی سے نیچے سیٹھ سورج لال

کو پولیس کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اس وقت بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔

اس وقت مایا کا نام ممتاز کی باہنہ میں گدا دیکھ کر گوردھن کا خون کھولنے لگا۔ اس نے ٹکوے سے اس باہنہ کو جسم سے الگ کیا۔ باہنہ میں سے گوشت کے اس حصے کو الگ کیا۔ جہاں ممتاز اور مایا کے نام تھے۔ پھر ٹکوے مار مار کے اس گوشت کے اس ٹکڑے کو قیمے کی طرح ریزے ریزے کر دیا اور اسے مین ہول میں پھینک دیا۔ یکایک اس نے ممتاز کے سر کو پھر پکڑ لیا۔ اور وحشیانہ خوشی سے چلا کے بولا۔ اب بول۔ اب بول حرام زادے۔ ممتاز کا خاموش تنا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے رات کا سارا واقعہ یاد آیا۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا شہر میں ہندو مسلم فساد ہو رہا تھا، بمبئی میں باہر سے ہزاروں لاکھوں سندھی مہاجر آ رہے تھے۔ مسلمان علاقوں سے ہندو بھاگ رہے تھے۔ اور ہندو علاقوں سے مسلمان۔ دادر اور پریل کا علاقہ گو ہندوؤں کا تھا لیکن ممتاز ابھی تک وہیں جما ہوا تھا۔ اس کے بہت سے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ سود خور پٹھان سب رخصت ہو چکے تھے لیکن ابھی تک مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی ممتاز کے بل بوتے پر سیٹھ سورج مل۔ تردیدی لال اور گوردھن داس کی کھولیوں میں رہ رہی تھی ان میں سبھی لوگ غنڈے نہیں تھے بیشتر شریف آدمی تھے۔ محنت مزدوری کرنے والے کاریگر، کلرک، چھوٹے چھوٹے دکاندار اور میکنک تھے۔ موٹر ڈرائیور، کلینر، گلی گلی سودا بیچنے والے، فلم ایکسٹرا اور ادیب تھے۔ غرض ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ اور یہ سب یہ جانتے ہوئے بھی کہ ممتاز غنڈہ ہے۔ کئی خون کر چکا ہے۔ کئی عورتیں اغوا کر چکا ہے اسی پر بھروسہ کر رہے تھے۔ ایک عجیب بے بس اور معصوم سا بھروسہ جسے محسوس کر کر کے ممتاز کو ان لوگوں پر رحم آنے لگا۔ اس کے دل میں کوئی نامعلوم عجیب سی چیز جاگنے لگی، ایسی چیز جو شاید بچپن میں اس نے اپنی ماں کی گود میں محسوس کی تھی۔ اپنی خالہ کی ننھی لڑکی کے ساتھ کھیلتے ہوئے محسوس کی تھی۔ جہلم کے کنارے ریت کے گھروندے بناتے ہوئے محسوس کی تھی۔ وہ نامعلوم سی ہاتھ نہ آنے

ہاتھ لگاتے ہی لاجونتی کی طرح ایک کونے میں دبک جانے والی شرمیلی نرمی ایک کونپل کی طرح اس کے دل میں پھوٹنے لگی، اور وہ خود حیران ہو گیا کہ ان لوگوں کا حیرت ناک بھروسہ اسے کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ کیا سے کیا ہوا جا رہا ہے۔ اس وقت علاقے کے جتنے غنڈے تھے سب ہندو مسلم فساد میں لگے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے۔ خون سے بھی اور روپے سے بھی لیکن وہ دن بدن فساد سے دُور ہٹتا گیا، اپنے علاقے میں اس نے فساد کرنے والوں کو روک دیا۔ اب وہ دن رات گشت کرتا تھا اور اپنے علاقے کے ہندو اور مسلمان دونوں کو لڑائی جھگڑے سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ بہت سے مسلمان غنڈوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور بھنڈی بازار چلے گئے۔ بہت سے ہندو غنڈوں نے اس پر بزدلی کا الزام لگایا۔ مگر ممتاز بدستور اپنے علاقے کی نگہداشت میں مصروف رہا۔ وہ ہر روز سیٹھ سورج مل، ترویدی لال اور گوردھن داس کے گھر میں حاضری دیتا۔ اور ان سے اپنے کارنامے بڑے فخریہ لہجے میں بیان کرتا کہ آج کس طرح اس نے اپنے علاقے میں ہندو مسلم فساد کو روک دیا اور کل فلاں جگہ پر کس طرح عین موقع پر پہنچ کر اس نے حالات پہ قابو پا لیا۔

سیٹھ لوگ خوش ہو کر اس کی تعریف کرتے اسے روپیہ پیسہ بھی دیتے اور ہر طرح سے اس کی عزت کرتے اور ممتاز یوں خوش ہو کے پلٹتا جیسے وہ واقعی کوئی کارِ نمایاں سرانجام دے کے واپس آ رہا ہے۔

لیکن سیٹھ سورج مل، ترویدی لال، گوردھن داس ممتاز سے درپردہ خفا ہو گئے تھے کیونکہ وہ اپنے علاقے سے مسلمانوں کا اخراج چاہتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں مسلمانوں سے کوئی خاص بیر تھا۔ یہ مسلمان لوگ تو برسوں سے ان کی بلڈنگوں، چالیوں اور کھولیوں میں رہتے تھے اور برسوں سے ممتاز ان سے بڑی خوش اسلوبی سے کرایہ وصول کرتا آ رہا تھا۔ لیکن اب یہ مصیبت

آپڑی تھی کہ سینکڑوں ہزاروں اور لاکھوں سندھی مہاجر اپنی دولتوں کو سمیٹے ہوئے بمبئی آ رہے تھے۔ اور ان لوگوں کو مکانوں کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ مکان کے لئے پگڑی دینے کے لئے بھی تیار تھے اور بلیک میں زیادہ کرایہ بھی مل رہا تھا۔ مکانوں کی پگڑیاں ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں۔ بلیک میں ایک کمرے کے دام ڈھائی سو سے ڈھائی ہزار تک ہو گئے تھے۔ اور یہ بے وقوف ممتاز تھا کہ اپنے علاقے میں ہندو مسلم فساد ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اب فساد نہیں ہوگا تو مسلمان ڈر کے بھاگیں گے کیسے۔ کمرے کیسے خالی ہوں گے۔

یہی سوچ سوچ کر آخر ایک روز سیٹھ سورج مل، ترویدی لال، گوردھن داس نے ایک خفیہ میٹنگ کی اور سب کچھ طے کرنے کے بعد پٹوردھن کو بلوایا۔

پٹوردھن نے ٹکوے کے آخری وار سے ممتاز کا سر گردن سے جدا کر دیا۔ پہلے تو اس نے گردن سے نیچے کا حصہ مین ہول میں پھینک دیا پھر اس نے ممتاز کے سر کو بالوں سے پکڑ کر ناریل کی طرح ادھر ادھر جھلایا لیکن جب سڑک کے آر پار حدِ نظر تک اس کی فتح کو دیکھنے والا کوئی نظر نہ آیا تو اس نے ممتاز کے سر کو بھی مین ہول کے اندر پھینک دیا اور پھر گوشت کے دوسرے ٹکڑوں کو بھی ادھر ادھر سے چن کر مین ہول میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ فرش سے اٹھا اور سامنے میونسپلٹی کے نل پر چلا گیا۔ نل کھول کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ خاکروبوں کے مندر میں سامنے سے نظر آنے والی گنیش جی کی مورتی کو بڑے ادب سے پرنام کیا۔ اب اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور وہ ٹرام کی لائن پر چلتا ہوا ایک ریستوران تک آیا جو نیا نیا کھلا تھا۔ آئینے، کرسیاں، سنگِ مرمر کی میزیں، کونٹر۔ سارا فرنیچر نیا معلوم ہوتا تھا۔ پٹوردھن جھومتا جھامتا سیدھا ریستوران کے اندر گھس گیا۔ اور ایک سپید براق سنگ مرمر کی میز پر مکا مار کر بولا۔ ہمیں سخت بھوک لگی ہے کھانے کے لئے جلدی کچھ لاؤ۔

ریستوران کا مالک سندھی معلوم ہوتا تھا اس نے لڑکے سے جلدی میں کچھ کہا لڑکا بھاگتے ہوئے کچن میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر میں پٹوردھن کے سامنے روغن جوش کی ایک پلیٹ۔ اور ایک تنوری نان رکھا ہوا تھا۔

پٹوردھن غصے میں ایک دم بھنا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور چیخ کر بولا۔ تم جانتے نہیں ہو میں برہمن ہوں۔ میں گوشت نہیں کھاتا۔ پٹوردھن نے گوشت کی پلیٹ اٹھا کے مالک کے منہ پر ماری اور غصے میں بڑبڑاتا ہوا ریستوران سے باہر نکل گیا۔

ناگ اور شبنم

سُرخ لباس میں وہ بے حد حسین دکھائی دیتی تھی۔ چمکتے ہوئے گورے گورے گال، چینی کی پلیٹ کی طرح چکنے، موتیوں کی طرح سپید دانت اور آنکھوں میں ایک عجیب بھولپن۔ کھلے آسمان کی طرح وہ نیک اور برگزیدہ آنکھیں، جنگلی کنول کی طرح اپنی پلکیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

وہ دیودار کے پیڑ کے نیچے مٹی کے ایک چبوترے پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی جہاں ہائیڈرینجر کے پیلے، گلابی اور نیلے پھول کھلے تھے۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ نہ ٹھٹکی، نہ گھبرائی، نہ اپنی جگہ سے سرکی۔ سر سے پاؤں تک اک نگاہ اُس نے مجھ پر کامل اعتماد سے ڈالی اور بولی:

"آپ کا بستہ کہاں ہے؟"

گلابی رنگ کا ایک بستہ وہ اپنے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھی۔ اور بار بار چند لمحوں کے بعد

وہ اُسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر جھلانے لگتی تھی، اور اُسے جھلاتے ہوئے بار بار میری طرف انتہائی مسرور نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی۔

"میرا بستہ کھو گیا!" میں نے جواب دیا۔

"کس خوشی میں؟" اُس نے اپنے بستے کو نیچے گھاس پر گرانتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اس کی معصوم آنکھوں کی پتلیوں میں دیکھا۔ لیکن مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔ بھلا بستہ کھونے میں کیا خوشی ہے۔ کسی چیز کے کھونے میں کیا خوشی ہے؟ ایسا فلسفہ تو میری عمر کے دانش مند لوگوں کی سمجھ میں کیسے آسکتا ہے۔ جب کہ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ زندگی کی ساری خوشی کھونے میں نہیں، پانے میں ہے، اور حاصل کرنے میں ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا، منافع اگلنے والا ایک کارخانہ، ہیروں کا ایک ہار، ایک لمبی کار، دوسروں کو زیر کرنے کی طاقت۔ ساری زندگی کی خوشی تو یہی کچھ پانے اور حاصل کرنے، اپنا بھلا اور دوسروں کا بُرا چاہنے میں ہے۔ پھر میں ڈھائی سال کی اس چھوٹی معصوم بچی سے کیا کہوں۔ کس خوشی میں آدم نے جنت کو کھو دیا۔ کس خوشی میں مسیح صلیب پر لٹک گئے، کس خوشی میں گاندھی نے گولی کھائی، حسین نے کیوں جام شہادت پیا؟ ندیاں اپنا پانی سمندر کو کیوں دے دیتی ہیں؟ پھول اپنا پولن ہواؤں میں کیوں بکھیر دیتے ہیں۔ عاشق کسی کی محبت میں کیوں مر جاتے ہیں۔ عاقل، زیرک، جاہ طلب، دو اور دو چار کرنے والی دنیا کھونے کا مزہ اور اس کی لذّت کیا جانے؟

میں اُس کے لئے مکمل اجنبی تھا۔ اور جب اس نے مجھے جواب دینے سے قاصر پایا، تو وہ ایک بے حد دل کش اور مربیانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جیسے ماں اپنے احمق بچے کو دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پھر اُس نے ایک ننھا سا بستہ کھولا اور اُس میں سے چھ سات رنگا رنگ پنسلیں نکالیں اور پھر ایک پنسل میرے ہاتھ میں تھما کر کہا۔

"لو اس سے لکھو میرے بستے پر!"

کاغذ پر لکھنا کتنا آسان ہے، مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے بستے کے کپڑے پر پنسل سے لکھنے کی کوشش کی۔ بچی میری ناکام کوشش کو دیکھ کر مسکرائی۔ اُس نے پنسل میرے ہاتھ سے چھین لی۔ اور پنسل کے نوک دار سرے کی طرف اشارہ کرکے بولی:

"ادھر سے مت لکھو۔" اور پھر پنسل کے اَن گھڑے سرے کی طرف اشارہ کرکے بولی: "ادھر سے لکھو تو لکھا جائے گا۔"

میں پنسل کے اَن گھڑے سرے سے بستے پر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بستے پر کچھ تو نہیں لکھا جا رہا تھا۔ لیکن میرے ذہن کی تختی پر بہت سے نقش و نگار ہویدا ہو رہے تھے۔ بچی کا چہرہ، اس کے چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال، اس کی آنکھوں کی باریک اور گھنی پلکیں، اس کے ہاتھوں کی ننھی ننھی انگلیاں۔ وہ تصویریں جو میں پنسل کی نوک سے کبھی نہ بنا سکتا تھا، پنسل کے اَن گھڑے رُخ سے بنا رہا تھا۔ کبھی کبھی زندگی کو دوسرے رُخ سے دیکھنا بھی اچھا ہوتا ہے۔ غریب کام چور کیوں ہوتے ہیں۔؟ امیر بے ایمان کیوں ہوتے ہیں؟ خوبصورت عورتیں احمق کیوں ہوتی ہیں؟ سیب کیوں گرتے ہیں؟ عوام کیوں اٹھتے ہیں؟ کبھی کبھی پنسل کی دوسری نوک سے لکھنا اور دیکھنا بہت اچھا ہوتا ہے۔

میں اپنے ذہنی نقش و نگار میں مگن اس کے بستے پر جھکا ہوا تھا۔ یکایک میں نے بچی کے منہ سے خوشی کی ایک زور کی چیخ سنی اور سر اٹھا کے دیکھا کہ بچی دیو دار کے چبوترے سے بہت دور آگے جا چکی ہے۔ اور گھاس کے سرسبز لان پر ایک سانپ کو اُٹھائے ہوئے اُس سے کھیلتے ہوئے کہہ رہی ہے۔

"آہا! میرا بھالو، میرا لمبا بھالو!"

اور وہ جو بھالو نہ تھا، بلکہ ہری اور زرد چتیوں والا ایک پہاڑی سانپ تھا، بچی کے ہاتھ میں بل کھا رہا تھا۔ اور اپنے آپ کو اس کے بانہہ کے گرد لپیٹ رہا تھا اور کھل رہا تھا۔

میرا خون خشک ہو گیا اور میرا جسم وہیں چبوترے پر بیٹھا بیٹھا خوف اور دہشت سے جامد ہو گیا۔ اور میں پھٹی پھٹی مبہوت نگاہوں سے اس انجان معصوم بچی کو سانپ سے کھیلتے اور اس سے پیار کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔ بچی کے ایک ہاتھ میں سانپ تھا اور دوسرے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ جو غالباً اس کی آیا اس کے ہاتھ میں تھما کر چلی گئی تھی۔ اور چاروں طرف خوبصورت مرغزاروں والے پہاڑ تھے۔ اور سبز مخملیں گھاس پر ڈیزی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور موسم اپریل کا تھا۔ اور دیودار کے پیڑوں پر انگور کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور ہواؤں میں شہد کی مکھیوں کی گونج تھی۔ اور ایک بچی سانپ سے کھیل رہی تھی۔

یکایک بچی نے سانپ کا منہ دودھ کے گلاس میں ڈھکیل دیا۔ اور بولی۔

"دودھ پیو گے بھالو۔ میرے بلے بھالو۔۔۔"

سانپ بل کھاتے ہوئے دھیرے دھیرے بچی کے ہاتھ میں کھلتا گیا۔ اب اس کا سارا جسم گھاس پر تھا۔ اور منہ دودھ کے گلاس میں تھا، اور بچی اُس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے کہہ رہی تھی۔

"آپ ہایت اچھے ہیں۔ آپ ہایت (نہایت) اچھے ہیں۔ جب میں اسکول جایا کروں گی تو تم کو اپنے بستے میں بند کر کے ساتھ لے جایا کروں گی۔ میرے بھالو!

سانپ دودھ پی کر مست ہو گیا۔ اور نیم رقص کے انداز میں گھاس میں سرسراتے ہوئے بچی کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ چمکدار دھوپ میں اُس کے جسم کی سبز اور زرد چتیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ اس رقص اور سرمستی کے عالم میں دودھ کا گلاس اس کے جسم سے ٹکرا کر گر گیا اور باقی

دودھ گھاس پر بکھر گیا۔ سانپ تیزی سے زبان بار بار نکالتے ہوئے گھاس کے خوشوں پر سے دودھ چاٹنے لگا۔ اُس کی دُم ہولے ہولے لڑکی کے ہاتھوں سے یوں مس ہو رہی تھی، جیسے احسان مندی کے عالم میں اس بچی کے ہاتھ چوم رہی ہو۔

"سانپ! سانپ!!"

یکایک حیرت، ڈر، خوف اور وحشت میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی چیخ سنائی دی اور میں نے دیکھا کہ بچی کی آیا دوڑی دوڑی کہیں سے آئی، اور اس نے جھپٹ کر بچی کو گھاس سے اُٹھا لیا اور اُسے لے کر ایک طرف بھاگی۔ پھر اُس کی وحشیانہ چیخیں سنائی دیں۔

"مالجو! مالجو! سانپ سانپ۔ اِدھر آنا مالجو۔ سانپ ہے سانپ۔" آیا زور سے چیخ رہی تھی اور گھاس پر سرکتے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

یکایک خالی برآمدے کے اندر کے کمروں سے بہت سے لوگ نکل آئے: بچی کی ماں، بچی کا باپ، بچی کا بھائی اور دوسرے لوگ۔ اور دُور پرے گھاس کے دوسرے قطعے میں کام کرتا ہوا مالجو مالی بھی ایک بیلچہ لے کر بھاگا۔ ماں وحشت سے چلائی۔

"ہائے! ہائے! میری بچی! مالجو مالی!"

ماں بے اختیار بچی کی طرف بھاگی اور اُس نے بچی کو آیا سے چھین کر اپنے گلے لگا لیا اور اس کا منہ چوم چوم کر رونے لگی۔ ماں کو روتے دیکھ کر بچی بھی سہم گئی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس کی ماں کیوں رو رہی ہے۔ مالجو اونچی روش سے نیچے گھاس کے لان پر کود گیا۔ اور بیلچے کی ہتھی سے سانپ کو مارنے لگا۔

بچی مالجو کو بیلچے کی ہتھی سے سانپ کو مارتے دیکھ کر رونے لگی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلا کر رونے لگی۔

”مالجو میرے بھالو کو مار رہا ہے۔ ارے میرے بلے بھالو کو مارتا ہے۔ ممی میرے بھالو کو بچا لو!“
ماں نے غصّے سے ایک چانٹا بچی کے گال پر رسید کیا اور زور سے بولی۔

”وہ بھالو نہیں تھا، سانپ تھا، زہریلا سانپ۔ وہ تجھے کاٹ کھاتا، اور تو اس کے زہر سے مر جاتی۔“

”مالجو نے ہتھی کے آخری وار سے سانپ کو ہلاک کر دیا۔ سانپ گھاس پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔“

زندگی میں پہلی بار یکایک بچی کی آن بان اور بے گناہ آنکھوں میں خوف اور وحشت کا زہریلا پھن لہرایا، اور وہ زور کی چیخ مار کر اپنی ماں کی باہنوں میں بے ہوش گئی۔

وہ چیخ سن کر پہاڑوں کے کنگرے لرز اٹھے۔ ڈھلوانوں کے جھرنے سہم گئے۔ پھولوں کی شبنم سوکھ گئی۔ اور گھاٹیوں میں کلیلیں کرنے والے غزال آنے والی موت کی وحشت سے کانپ گئے۔

مالجو نے سانپ کو مار کر میری طرف دیکھا۔ اور پھر وہ بیلچہ اپنے کندھے پر رکھے ہوئے دیودار کے چبوترے کی جانب بڑھا اور میری طرف دیکھ کر پر غرور انداز میں کہنے لگا۔

”میں نے سالے کو مار دیا۔“ اس نے سانپ کی طرف اشارہ کیا۔

”کس خوشی میں؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مالجو حیرت سے میرے منہ کو تکنے لگا۔ جیسے کسی انوکھے جانور یا پگلے کو دیکھ رہا ہو۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔

”تم کون ہو؟“

”میں؟ میں معصوم ہوں۔“ میرے منہ سے نکلا۔ مگر مالجو کچھ نہیں سمجھا۔ پھر بولا۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟“

"مسافر ہوں۔ یونہی ذرا دم لینے کے لئے دیودار کے اس چبوترے پر بیٹھ گیا تھا۔" میں نے نرم لہجہ میں کہا۔

"تو اب کہاں جاؤ گے؟" مالجو میرے نرم لہجہ سے کچھ نرم پڑ گیا۔

"کہیں نہیں جاؤں گا میرے بھائی۔" میں نے مالجو کو اپنی قسمت بتاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی شکستہ دنیا کی دراڑوں میں رہوں گا، اور کبھی کبھی باہر گھاس پر رقص کرنے کے لئے آ جایا کروں گا۔ تاکہ تم مجھے ہلاک کر سکو۔"

جنّت کے مزے

۱

ماہم چرچ کے باہر فٹ پاتھ پر ہم پانچوں سداشیو سنتری کے ساتھ ٹھرّا پی رہے تھے۔ میں اور بالکو جو چور تھا۔ تانتیا جو گرہ کٹ تھا اور ابھی جیل سے چھوٹا تھا۔ جمنا جو طوائف تھی۔ عبدل جو سامنے کے ایرانی ریستوران میں دن کو بیراگیری کرتا تھا اور رات کو ٹھرّے کی بوتلیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا۔ رات نشے کی طرح گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور ایک آتشیں گھونٹ کی طرح جیسے ہمارے گلے سے اُتر رہی تھی۔

دو بجے کے قریب سداشیو مستی کے عالم میں بولا ”اور منگاؤ!“

تانتیا کی جیب میں صرف بارہ روپے آٹھ آنے باقی رہ گئے تھے۔ وہ بولا ”اور کدھر سے منگاؤں اب صرف کھولی کا بھاڑا باقی ہے۔ وہ میں دینے کا نہیں!“

”جیل جانا مانگتا ہے؟“ سداشیو سنتری نے اُسے دھمکی دی۔

ناتیا نے غرور سے کہا۔ "جب کھرا دھندا کروں گا تو جیل کیوں جاؤں گا؟"

سداشیو کو اب چڑھ گئی تھی اُس نے کنکھیوں سے بابکو کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تُو کیا کہتا ہے بابکو؟ چھگن کی دوکان کی چوری کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ سوچتا ہوں سراغ لگا ہی لوں!"

بابکو ایک منٹ تک سداشیو کو گھورتا رہا۔ پھر کچھ کہے سُنے بغیر گھوم گیا اور عبدل کو اشارہ کرکے بولا "میرے ساتھ آؤ!"

سداشیو زور سے ہنسا اور بابکو اور عبدل کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ دونوں چرچ کے پیچھے کی گلی میں غائب نہ ہو گئے۔

وہ گلی دن کو سوتی ہے۔ رات کو جاگتی ہے اور اپنا تنگ و تاریک دہانہ کھولے کیچڑ میں لت پت کسی مگرمچھ کی طرح منہ کھولے ہوئے نظر آتی ہے۔ تاریکی اور ملگجی روشنی کی ملی جلی دُھند میں لپٹی ہوئی کہر آلود عورتیں دروازوں کے اندر جاتی اور باہر نکلتی دکھائی دیتی ہیں۔ بچے بوتلیں کھنکھناتے ہوئے ادھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ عورتیں بیسن کی پکوڑیاں یا مچھلی کے ٹکڑے یا بھینس کے کباب تلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لکڑی کے نیم تراشیدہ بینچوں پر گاہک ٹھرا پیتے نظر آتے ہیں۔ اس گلی کے باہر گھر میں ایک چھوٹی سی بھٹی ہے۔ جب ایک گھر کا ٹھرا ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے گھر سے اُدھار لے لیا جاتا ہے۔ یہ گلی ہر مہینے پانچ سو روپیہ بھتہ دیتی ہے۔ ورنہ دھندا ایک دن نہ چلے۔ پھر بھی پولیس مہینے میں دو بار چھاپے مارتی ہے۔ اور مال برآمد کرتی ہے۔ اور دو ایک دوکانداروں کو گرفتار کرکے لے جاتی ہے اور یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی تجویز کے زیرِ تحت ہوتا ہے! ٹھرا بیچنے والے گرفتار بھی ہوتے ہیں، سزا بھی پاتے ہیں، جیل بھی جلتے ہیں۔ لیکن ٹھرّے کا دھندا چلتا رہتا ہے اور گرفتار ہونے والوں کے گھروں اور اُن کے بال بچوں کی پوری کفالت گلی کرتی ہے۔

اس لئے کہ ٹھرّے میں بہت نفع ہے۔ دارُو کا پرمٹ بیس روپے میں ملتا ہے۔ دس روپے

ڈاکٹر ایک سرٹیفکیٹ کے لیتا ہے۔ تیس روپے ہوئے۔ پھر گھٹیا سے گھٹیا شراب کے دام جو لائسنس یافتہ دوکان پر فروخت ہوتی ہے، بہت زیادہ ہیں۔ ستائیس روپے سے کم میں کوئی بوتل نہیں آتی، اور ٹھرے کی بوتل صرف چار روپے میں بکتی ہے غریب لوگ جو نہ دارو کا پرمٹ لے سکتے ہیں، نہ ڈاکٹر کی فیس دے سکتے ہیں، نہ بلیک سے ڈسٹلری کی شراب لے سکتے ہیں، ٹھرے کی کاٹیج انڈسٹری کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ بھلانا چاہتے ہیں اور بھولنا چاہتے ہیں۔ کیچڑ کو اور گالی کو، پھٹے کپڑوں کو اور رستی ہوئی چھت کو، بھوک کو اور بیماری کو۔ اور سیاہ سلاخوں والے نااُمیدی کے اس بڑے پنجرے کو جن میں اُن کی زندگیاں مقید ہیں اور جن سے نکلنے کا اُنہیں کوئی راستہ نہیں ملتا۔ کبھی کبھی ایک تلخ گھونٹ اُتار کر انسان زندگی کی ساری تلخیاں اور مجبوریاں بھولنا چاہتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے دُھند چھٹ جاتی ہے، آسمان صاف ہو جاتا ہے۔ تارے نکل آتے ہیں۔ چاند پھول کی طرح کِھل اُٹھتا ہے۔ پُرانی اُمیدیں دُھلے دُھلائے کپڑوں کی طرح تار کی الگنی پر چمکنے لگتی ہیں! دل کے اندھیارے میں کوئی سحر جھولتی ہے ماں کا چہرہ یاد آتا ہے۔ بیوی کے ماتھے کا سیندور، توتلے بچوں کی نرم نرم بانہیں۔ ان سب کے لئے جینا ہوگا اور زندگی کے لئے لڑنا ہوگا۔ ایک گلاس اور دو یا جام کو اتنا تلخ کر دو کہ اُس کی تلخی میں زندگی کی دوسری تلخیاں بھول جائیں .....!

ہومی مستری پارسی باوا کی بھٹی اس گلی میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا مکان بھی سب سے بڑا تھا۔ اُس کی بکری بھی سب سے زیادہ تھی۔ اُس کے پاس ایک موٹر بھی تھی۔

باسکو عبدل کو لے کر مستری باوا کے ہاں پہنچا۔

"صاحب جی!" باسکو نے پارسی باوا کو پکارا۔

"صاحب جی!" کہہ کر پارسی باوا نے جواب دیا۔

"چار بوتلیں ٹھرے کی دو!" باسکو بولا۔

"سولہ روپے نکالو!" مستری نے کہا۔

"پیسے تو نہیں ہیں۔" باسکو نے بتایا۔

"تو جاؤ۔" مستری باوا بولا اور گھر کا دروازہ بند کرنے لگا۔

باسکو نے جلدی سے اپنا مضبوط پیر دروازے کے اندر رکھ دیا اور بولا۔

"سیٹھ! تمہاری گاڑی کا ایک ٹائر پھٹیلا ہے۔"

"ہاں پھٹ تو گیا ہے!"

"نوا ٹائر لیگا؟"

"کتنے میں؟" پارسی باوا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"ستر روپے میں!"

"ستر روپے تو بہت ہیں۔ میں تم کو چار باٹلی دے دوں گا!"

"سیٹھ! نوا ٹائر سوا دو سو میں آتا ہے۔ وائٹ لائن کا۔ میں ستر میں دوں گا۔ جونا حال ہوگا تو پیسے واپس!"

"چل، آٹھ باٹلی ٹھرا اور دس روپے ساتھ میں۔"

"سوا دو سو کا مال چھبیس روپے میں؟" باسکو ہنسا۔ "چور کو چور ٹھگے گا تو دھندا کیسے ہوگا۔"

"اچھا بیس روپے اوپر دوں گا۔ مگر مال نوا ہونا چاہیئے۔"

"پچیس پر سودا کر دو اور چار باٹلی ابھی اُدھار دے دو۔ دو گھنٹے میں مال آتا ہے؟"

پارسی باوا سے چار باٹلی لے کر باسکو عبدل کے ساتھ روانہ ہوا۔ گلی سے نکل کر اس نے عبدل کے ہاتھ میں چار باٹلیاں دیں اور بولا "اُدھر پہنچا کر گلوب موٹرز کے گیراج کے پچھواڑے آجاؤ۔"

جب عبدل بوتلیں پہنچا کر گلوب موٹرز گیراج کے پیچھے پہنچا تو باسکو پیچھے کے روشندان تک

ایک رسّی لٹکا چکا تھا۔ وہ عبدل سے بولا "گیراج کا لاک بہت مضبوط ہے۔ کھلتا نہیں ہے۔ سب کھڑکیاں بھی اندر سے بند ہیں۔ تم کو روشندان کے ذریعے گیراج کے اندر گھس کر ایرانی ہوٹل والے کی گاڑی کا ٹائر نکالنا ہوگا۔"

عبدل نے انکار میں سر ہلایا "ہم باٹلی کا دھندا کرتا ہے مگر چوری نہیں کرتا ہے۔"

باسکو نے غصّے میں آکر گھونسہ مارا۔ عبدل سولہ سال کا لڑکا تھا۔ سہم گیا۔ دھیرے سے بولا۔ اُستاد! میں ایرانی کے ہاں نوکر ہوں۔ اُس کو پتہ چل گیا تو نوکری بھی ہاتھ سے جائے گی۔!"

باسکو بولا "اگر میں گیراج کے اندر جا سکتا تو تم کو نہیں بولتا۔ پر اس ٹائم مجبوری کی بات ہے۔ تم کو روشندان سے اندر جانا ہوگا۔ تم کو گلوب موٹرز گیراج کے اندر کا سب حال معلوم ہے۔ تین مہینے تم قاسم بھائی میکینک کے انڈر میں کام کر چکے ہو۔ ایرانی کی گاڑی تم پہچانتے ہو۔ تم کو معلوم ہے قاسم بھا وہیل پانا اور جیک کدھر رکھتا ہے۔ جیک چڑھا کر وہیل پانے سے ایک ٹائر نکال کے لے آؤ۔ اندر کی کھڑکی کھول کے ٹائر باہر پھینک دو اور چھلانگ لگا کر باہر آ جاؤ۔ سب کام پندرہ منٹ میں ہوگا۔ جاستی بات مت کر!"

"نہیں۔ ہم چوری نہیں کرے گا!" عبدل نے بہت زور سے سر ہلایا۔

باسکو نے اُسے گردن سے پکڑ لیا اور چاقو نکال کر اُس کا پھل اُس کی گردن کی جلد پر رکھ کر تی لہجے میں بولا "اندر جائے گا کہ نہیں؟"

عبدل نے چاقو کی تیز دھار کو اپنے گلے پر محسوس کیا۔ باسکو کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ سے عبدل کی آنکھیں باہر نکلنے لگیں۔ گلا رُکتا ہوا معلوم ہوا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ باسکو نے چاقو ہٹا لیا۔ عبدل کو چھوڑ دیا۔ رسی اس کے ہاتھ میں دے دی۔

دھیرے دھیرے عبدل رسّی پر چڑھنے لگا۔

روشندان کے اندر گھس کر اس نے باہر کی رسّی اندر کھینچ لی۔ اور دھیرے دھیرے گیراج کے گہرے اندھیرے میں یوں اُترنے لگا جیسے کسی کنویں کے اندر اُتر رہا ہو۔ سانس روک کر دھیرے دھیرے وہ نیچے اترتا رہا۔ چند لمحوں تک رسی کے آخری سرے کو پکڑ کر نیچے لٹکتا رہا اور دونوں پاؤں کو نیچے جھکا کر فرش کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس کے پاؤں فرش پر نہ پڑے تو رسّی چھوڑ کر نیچے پھلانگ گیا۔

فرش پر گرتے گرتے اُس کا پاؤں پٹرول کے ایک خالی ٹین سے ٹکرایا۔ اور اس کے دماغ میں جیسے اکدم لاکھوں توپیں چھوٹ گئیں۔ اُس آواز سے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ساری دُنیا جاگ گئی ہے اور چور! چور!! کہہ کر اس کی طرف دوڑ رہی ہے۔ چند لمحوں کے لئے اس کے ماتھے، چہرے اور گردن سے پسینہ پھوٹ پڑا اور وہ چپکے فرش پر لیٹا لیٹا آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ جب گونج ختم ہوئی اور چند لمحے گزر گئے اور اُسے پکڑنے کے لئے کوئی نہ آیا تو اُس نے آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گلوب گیراج میں وہ تین مہینے کام کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں پر ہے۔ روشنی کا سوئچ کدھر ہے؟ اوزار کہاں پڑے ہیں۔ گاڑیاں کدھر رکھی جاتی ہیں؟ وہ سب جانتا تھا لیکن سوئچ دبا کے روشنی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی اور جب آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئیں تو اُسے آس پاس کی فضا کی تاریکی میں زیادہ گہرے تاریک خطوط نظر آنے لگے۔ گاڑیوں کی باڈی کے خم اور اوزار کی الماری اور ایک کونے میں ایک لمبی میز کی مستطیل نما تاریکی۔ ہولے ہولے وہ ٹٹولتا ہوا فرش پر گھسٹتا ہوا۔ گاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ بانسکو کی دی ہوئی جیبی ٹارچ اُسے یاد آئی۔ بڑی احتیاط سے اُس نے کئی گاڑیوں کے مڈگارڈ کی اوٹ میں سے جا کر، جیبی ٹارچ کو کئی جگہ روشن کیا۔ اور جب اُسے آسی ایرانی کی گاڑی مل گئی تو وہ چند لمحوں تک اُس کے قریب کھڑا اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ ایرانی ہوٹل والے کی گاڑی اسے بہت پسند تھی، اس کا شربتی رنگ، اُس کے تیکھے خطوط، اس کا میٹھا سُریلا ہارن۔ جب چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔

جیسے تیر کمان سے نکلا جا رہا ہے۔ اس نے اس گاڑی کی طرف ہمیشہ ایسے دیکھا تھا جیسے کوئی بھکاری کسی شہزادی کو دور سے دیکھتا ہے۔ وہ کئی لمحوں تک اُس گاڑی کے قریب کھڑا اس کے خنک چکنے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا اور ایک عجیب لذت سے آشنا ہوتا رہا۔ پھر اُسے باسکو یاد آیا جو چاقو لئے گیراج کے باہر کھڑا تھا اور وہ گاڑی سے الگ ہو کر اوزاروں کی الماری کے اَدھ کھلے پٹ کی طرف گیا اور وھیل پانا اور جیک نکال کر ہولے ہولے سر جھکائے ہوئے ایرانی ہوٹل والے مالک کی شربتی رنگ کی مرسیڈیز کے پاس اُس کا ٹائر نکالنے کے لئے پہنچا۔!

اُس نے جیک اور وھیل پانا گاڑی کے مڈگارڈ کے نیچے رکھ دیا اور جیبی ٹارچ نکال کے روشن کی۔ روشنی کی چند کرنیں مڈگارڈ کے تاریک گڑھے سے چھلک کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ مرسیڈیز کا شربتی رنگ اس کی آنکھوں میں چھلکا اور اندر کی آرام دہ سبز رنگ کی سیٹیں ایک لمحے کے لئے روشن ہوگئیں۔ بے اختیار عبدل کا ہاتھ کرومیم کے ہینڈل پر گیا۔ ہینڈل گھمانے سے گھوم گیا اور دروازے کا پٹ کھل گیا۔ عبدل کو بے حد حیرت ہوئی۔ شاید میکینک غلطی سے کار کو بند کرنا بھول گیا تھا۔ اب کھلی کار کسی خوبصورت شہزادی کی آغوش کی طرح اس کے سامنے وا تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کر کے اندر روشنی ڈالی اور ایک لمحے کے لئے فٹ پاتھ پر سونے والے کی آنکھوں میں کار کی آرام دہ سیٹوں کی گداز خوبصورتی گھوم گئی۔ فرش کے چھوٹے چھوٹے دو ایرانی غالیچے اور سبز رنگ کی آرام دہ بستر نما سیٹ اور ریشمی کُشن، کناروں پر رکھے ہوئے اور سیٹوں سے اوپر پیچھے کے کانچ پر زرد گلاب کے پھولوں والے پردے گرے ہوئے۔ عبدل ایک لمحے کے لئے رُکا۔ پھر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اور گاڑی کے اندر گھس گیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اندر دھنس گیا۔ پھر سیٹ کے اندر کے اسپرنگوں نے اُسے اُوپر اُچھالا اور اس کا جسم ایک لمحے کے لئے جیسے فضا میں پتنگ لے کر اوپر آ گیا۔ اُس کے سارے جسم میں جھولتی ہوئی گدگدی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ خوف اور مسرت کے ملے جلے احساس سے

اُس نے اپنی ٹانگیں پہلے تو فرش کے غالیچے پر پساریں، پھر دلیری سے کام لے کر اُس نے اپنی دونوں ٹانگیں اُٹھا کر اوپر کی سیٹ پر رکھ دیں اور پورا دراز ہو گیا۔

آئے ہائے کتنا نرم، ملائم، چکنا، گداز، گُدگُدا بستر تھا۔ جیسے بالائی کی ایک ہزار تہیں اُن گدوں کے نیچے ہوں۔ ایک بار اُس نے ہوٹل کے کچن میں کانچ کے گلاس دھوتے دھوتے سب کی نظر سے بچ کر قریب کی میز پر پڑے ہوئے اَدھ کھُلے کریم کے ڈبے سے بالائی کا ایک چمچہ بھر کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا۔ وہ مزہ اور یہ مزہ بالکل ایک سا تھا! اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا سارا جسم زبان بن گیا ہے اور بالائی کھا رہا ہے۔ اس نے بازو بڑھا کر اوپر کے کُشن اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کورٹ میں قاسم بھائی نے بیان کیا "صبح جب میں نے گیراج کا دروازہ کھولا تو ملزم کھُلی مرسیڈیز کی پچھلی سیٹ پر بہت آرام سے لیٹا ہوا سو رہا تھا اور وہیں پانا اور جیک مڈگارڈ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ملزم ٹائروں کو چوری کرنے کی نیت سے گیراج میں داخل ہوا تھا۔

جرح کے دوران میں جب ملزم نے اپنی چوری کے ارادے کا اقبال کر لیا تو عدالت نے اس سے پُوچھا۔

"پھر تم نے چوری کیوں نہیں کی؟"

"مجھے نیند آ گئی سرکار!" عبدل نے جھجکتے جھجکتے اقبال کیا "مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بہشت کے کسی باغ میں ہوں اور جنت کے مزے لے رہا ہوں۔

"تین ماہ قید بامشقت!" عدالت نے مسکرا کر کہا۔

میں فٹ پاتھ کے پتھر پر لیٹا تھا۔ جمنا میرے سر سے جوئیں چن رہی تھی۔ ایک کھوکھلی ہنسی

ہنس کر بولی: "اب جنّت کے مزے آرہے ہوں گے عبدل کو جیل میں!"

"بچہ ہے۔ ابھی اُسے معلوم نہیں ہے کہ اس دُنیا کی جنّت ہم غریبوں کے لئے نہیں ہے۔ یہاں تو ہم بس جنت کے چند لمحے چُراتے ہیں۔ باقی ساری زندگی دوزخ میں گزرتی ہے!"

"اور اگر اُس دُنیا میں بھی جنّت نہ ملی تو؟" جمنا نے مجھ سے پُوچھا۔

"بکو مت۔ جوئیں چنو!"

شانِ خدائی

ایک روز کا ذکر ہے۔

میں چیرنگ کراس اسٹیشن سے نکل کر رنرز ہوٹل کی جانب فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ کہ یکایک کسی نے بالکل میرے قریب آکر زور سے چلّا کر کہا۔

”ہائی گڈ!“

میں زمین سے دو فٹ اوپر اچھل گیا۔ اچھلنے کے بعد جو نیچے گرا ہوں تو میرے قدم فٹ پاتھ پر نہیں تھے۔ بلکہ چنے بیچنے والے کی ٹوکری پر۔ دوسرے لمحے میں ٹوکری اوندھی ہو گئی چنے فرش پر پھیل گئے اور چنے والا مجھے گالیاں دینے لگا۔ ابھی میں مڑ کے دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اتنی اونچی آواز میں کون چلّا رہا ہے کہ کسی نے زور سے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

”[illegible]!“

اب جو میں نے غصے میں گھوم کے دیکھا۔ تو ایک نوجوان نیلے رنگ کی شارک سکن تپلون پر گلابی رنگ، کا بُش کوٹ پہنے جس پر سبز رنگ کے تربوز منقش تھے میری طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ میں اس قدر غصے میں تھا کہ چند لمحوں کے لئے میں نے اُسے بالکل نہیں پہچانا۔ میرے غصے کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر اس نوجوان نے ناک میں گنگنا کر پھر کہا۔

ڈونٹ یُو نو می

”جگ موہن لال کا پڑیا؟“

یکایک میں نے اُسے پہچان لیا۔ ارے! میرے منہ سے نکل گیا۔

”ارے لونچڑا تم ہو؟“ میں مسرت سے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ جگ موہن لال کاپڑیا۔ ہرمنہ! یہاں ہم سب اس نوجوان کو انتہائی پیار سے ”لونچڑ“ کہتے تھے۔ گھر والے ”جگ یا جگ، جگ“ حتیٰ کہ اس کی بیوی بھی اُسے ”جگجی“ کہہ کر پکارتی تھی جو آپ خود سمجھ جائیں گے کہ لونچڑ سے بہت دُور نہیں ہے۔ خیر میں نے اپنے غصے کو دُور کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کوئی تین سال سے تمہیں نہیں دیکھا۔ کہاں تھے تم؟“

”سٹیٹس میں ـــ“

(امریکہ سے آنے والا ہر آدمی امریکہ کو سٹیٹس کہہ کے پکارتا ہے اسٹیٹس کو یہ لوگ کیا کہیں گے، اس کے متعلق میں کچھ معلوم نہیں کر سکا۔)

”وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”ہوٹل میں چلو سب بتاؤں گا۔ اولڈ پارک میں ٹھہرا ہوں۔“

ہم دونوں اولڈ پارک کی جانب چلنے لگے۔ اتنے میں چنے والے نے کہا ـــ ”عجیب شان خدائی ہے۔“

"کیا بات ہے بھئی؟" میں نے بڑی متانت سے چنے والے سے پوچھا۔

"ارے صاحب آپ نے میری ٹوکری توڑ دی، میرے چنے زمین پر بکھیر دیئے، میری گوئیوں کی ہنڈیا اوندھا دی۔ اب پوچھتے ہو کیا بات ہے؟" چنے والا بازو ہلاتے ہوئے بولا۔

لونچرلے نے اپنی پتلون کی جیب کا زپ کھولا، اُس کے اندر سے پیلے رنگ کا ایک بٹوا نکالا، اُس کا زپ کھولا اور اُس میں سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چنے والے کو دیا۔ چنے والا بڑے غور سے پانچ روپے کا نوٹ دیکھنے لگا کہ شاید اس نوٹ میں بھی کہیں کوئی زپ نہ لگا ہو۔ پھر اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد اُس نے نوٹ کو جیب میں ڈال لیا۔ اور جب ہم آگے چلے گئے تو ہماری طرف زور سے چلّا کر کہنے لگا۔ "عجب شانِ خدائی ہے۔"

جب ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر ہم دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے تو مجھے اُسے اچھی طرح دیکھنے کا موقعہ ملا، وہ واقعی پہلے سے صحت مند ہو گیا تھا۔ اور موٹا بھی اور اب بہت تیز تیز باتیں کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جب تک ہندوستان میں تھا تو سیدھے سادے انداز میں حلق سے یا مُنہ سے باتیں کرتا تھا۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر فقرہ جو وہ بول رہا ہے حلق سے نکل کر ناک کی نالیوں میں گھس جاتا ہے اور وہاں سے گھومتا ہوا نتھنوں کی راہ سے باہر نکلتا ہے اس سے فقرے کی ساخت میں ایسی گولائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو زبان کو ایک نیا حُسن بلکہ اکثر اوقات جملوں کو بالکل ہی نئے معانی عطا کرتی ہیں۔ میں بہت دیر تک اُس کی باتیں، بلکہ اس کی باتوں کی گولائیاں سُنتا رہا۔ یہ سوچے بغیر کہ ان گولائیوں کے اندر کیا ہے۔ اسی دوران میں مجھے اس کا وہ زمانہ یاد آیا جب جگ موہن اور ہم دونوں منٹگمری کے ایک اسکول میں پڑھا کرتے تھے اور جب جگ موہن ایک بڑی پگڑی اور تہمد باندھے اسکول میں پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اور سب لوگ اس پر ہنسا کرتے تھے اور شریر بچے اُس کی طرف انگلی اٹھا اٹھا کر کہتے تھے۔

"لونچڑ دین"

"بجا دے بین"

"تہمد موٹا"

"پگ مہین"

اس وقت بھی لوگ جگ موہن کو لونچڑ کہا کرتے تھے۔ آج اس وقت میں اس کی باتیں سنتے سنتے وہی گیت زور زور سے گنگنانے لگا — جگ موہن باتیں کرتا کرتا چُپ ہو گیا۔ پھر ایک وقفے کے بعد شکایتاً بولا:

"بھئی اب تو مجھے لونچڑ نہ کہو۔ اب تو میں سٹیٹس سے ہو آیا ہوں، ٹریننگ لے کے آیا ہوں۔"

"کاہے کی ٹریننگ لے کے آئے ہو؟"

"تیل نکالنے کی ٹریننگ۔"

"کس کا تیل نکالنے کی؟"

"کاجو کا تیل نکالنے کی ٹریننگ۔"

"کاجو سے تیل یہاں بھی تو نکل سکتا ہے۔"

"نکل سکتا ہے مگر امریکہ میں بہت اچھی طرح نکلتا ہے۔"

"اوہ!"

اس کے بعد اُس نے گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے مجھے وہ چیزیں دکھائیں جو وہ امریکہ سے لایا تھا۔ جوتوں کے دس بارہ جوڑے تھے۔ ان جوتوں میں فیتے کی بجائے لوہے کی ایک مہین زنجیر جسے زِپ کہتے ہیں لگی ہوئی تھی۔ جوتا پہن کر زنجیر اُوپر کھینچ لینے سے جوتا پاؤں میں خود بخود فٹ ہو

جاتا ہے ۔ سامنے پتلونوں میں بھی بٹن کے بجائے زپ لگی ہوئی تھی ۔ قمیصوں اور سوئٹروں سے لے کر جرابوں تک میں زپ لگی ہوئی تھی ۔ پھر اُس نے مجھے کیلنڈر دکھائے جس میں ہر صفحے پر ایک ننگی امریکی عورت کی تصویر تھی ۔ مگر میں نے حیرت سے کہا " بھئی ان عورتوں کی زپ کہاں ہے ؟ یہ تو بالکل ننگی ہیں ۔"

اُس نے مُسکرا کر کیلنڈر کو بند کیا اور پھر اُس کے اُوپر ایک زپ چڑھا دی اور کہنے لگا ۔ " دیکھو یہ رہی ۔ اب کہو امریکہ عظیم الشان ملک ہے کہ نہیں ؟"

" واقعی ہے لونچڑا ۔ وہاں جُراب سے لیکر عورت تک ہر شئے لوہے کی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے ۔"

" شوئیر ، شوئیر " جگ موہن بات کو نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلانے لگا ۔ لونچڑ ہر بات میں شوئیر شوئیر اور فائن کہتا تھا اور جب کوئی چیز اُسے بہت پسند آجاتی تو وہ زور سے " ہُکی " کہتا تھا اور چنانچہ اُس کی پتلونیں فائن تھیں اور سوئٹر ہُکی ، اُس کی قمیض فائن تھی اور رُبش کوٹ ہُکی ، اُس کے جوتے فائن تھے اور اُس کی ٹائیاں " ہُکی " اور " ہُکی " کے آگے اگر کوئی لفظ ہے تو ریس کورس کا بُکی ہے مگر کبھی کبھی......

پھر لونچڑ کی ٹائیاں بڑی خوبصورت تھیں ۔ یہ دُہری ٹائیاں تھیں ۔ یعنی سیدھی بھی پہنی جاسکتی تھیں اور اُلٹی بھی ۔ اس کے علاوہ اُن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے ۔ کچھ ٹائیاں ایسی تھیں جو غالباً پُرانی چھینٹوں کے کپڑوں کو کاٹ کر تیار کی گئی تھیں ۔ کچھ ٹائیوں پر پُرانے غالیچوں کا دھوکہ ہوتا تھا ۔ کچھ ٹائیاں معلوم ہوتا تھا بچوّں نے اپنے ہاتھوں سے رنگی ہیں ۔ کچھ ٹائیوں کی گانٹھ اس قدر موٹی آتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی گدھے کی گردن پر باندھنے کے لئے تیار کی گئی ہیں ۔

لونچڑ نے ایک ٹائی مجھے دکھائی ، اس پر ایک طرف انعامی معمہ بنا ہوا تھا ، دوسری طرف

ایک زنانہ خواب گاہ کے اندر ایک عورت سو رہی تھی۔ میں نے پوچھا — یہ کیا ہے؟"

وہ بولا —" یہ دانشوروں کی ٹائی ہے"

" وہ کیسے؟"

وہ بولا —" تم بوجھو"

میں نے کہا" میں امریکی دانشور ہوتا تو بوجھ لیتا۔ اب تم کو بتانا پڑے گا"

وہ بولا شو پیئر، شو پیئر، دیکھو یہ ٹائی کہتی ہے دن کو معمہ حل کرو اور رات کو کسی خواب گاہ میں گھس جاؤ"

" سبحان اللہ کیا دانشوری ہے"

" اور یہ ٹائی دیکھو"

یہ ایک دوسری ٹائی تھی۔ اس کے ایک طرف پائپ میں سے دھواں نکل رہا تھا، دوسری طرف دو اونچی ایڑی کے جوتے تھے۔ ایک ٹائی کے زیریں حصے پر۔ دوسرا بالکل اوپر۔ دونوں ایڑیوں میں دس انچ کا فاصلہ تھا۔ اس نے کہا۔

" بوجھو کیا ہے؟"

میں نے سوچ سوچ کر کہا —" یہ ٹائی کہتی ہے کہ تمباکو نوش کرو گے تو بیوی پیٹے گی"

" ہا ہا ہا —" لونجڑ نے ہنستے ہوئے کہا —" تم بالکل گونگ گانزا ہو، ایک دم گونگ گانزا ہو"

میں نے غصے سے کہا —" اور تم ایک دم لونجڑ ہو۔ ایک دم لونجڑ!"

وہ میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا —" دیکھو غصے میں مت آؤ سکر۔ یہ ٹائی شام کے وقت پہنی جا سکتی ہے۔ جب شراب پینے کے لئے بار میں جاؤ تو اس پائپ والے حصے کو سامنے کر لو۔ شراب پیو اور تمباکو کا پائپ سلگا کر خوبصورت لونڈیوں کی براق ٹانگوں کی طرف دیکھو اور پھر جو پسند آجائے تو

ٹائی کا حصّہ بدل کے اُس کے ساتھ ڈانس کرو۔ ڈانس — سمجھے — ڈانس — پھر ایک ایڑی نیچے ایک ایڑی اُوپر۔ بیچ میں دس اِنچ کا فاصلہ — سامبا ناچ کی طرح — ہا ہا ہا!"

اس کے بعد اُس نے بُش کوٹ اُتار کے ایک امریکی قمیض پہن لی جس کے کالر ایک دوسرے سے زاویہ منفرجہ بناتے ہوئے اتنے الگ ہو جاتے تھے کہ ان کے بیچ میں ایک چھوڑ تین ٹائیاں لگائی جا سکتی تھیں۔ مگر میرے دوست نے اس وقت صرف وہی اُونچی ایڑیوں اور دھواں نکالنے والے پائپ کی ٹائی پہننے پر اکتفا کیا اور چونکہ اب شام ہو چکی تھی اور ابھی بمبئی میں امتناعِ شراب نوشی کا قانون نافذ نہ ہوا تھا اس لئے وہ مجھے اپنے ہوٹل کے اسپیشل بار میں لے گیا۔ وہ بولا۔

"تم کیا پیو گے؟"

میں نے کہا ۔ "میں صرف وہسکی پیوں گا؟"

وہ بولا — "کیا ڈرنک ہے ۔ اِسے صرف انگریز یا نیم انگریز ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانی پیتے ہیں۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ تم کوکا کولا پیو اور چیونگ گم کھاؤ ۔"

میں نے کہا — "غم تو میں روز کھاتا ہوں، کوئی نئی بات بتاؤ۔"

وہ بولا — "بوائے او بوائے! میں آج تمہیں ایک نئی امریکی کاک ٹیل پلاتا ہوں۔" اس کے بعد وہ اپنی مگرمچھ کی کھال کی پیٹی ہلاتا ہوا بارمین کے پاس چلا گیا اور نہ جانے اُسے کیا اَنٹ سنٹ شرابیں ملانے کو کہتا رہا۔ بہرحال جب پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ مسرّت سے ہاتھ ملتا ہوا میرے پاس آیا تو بیرے نے دو جام ہمارے سامنے لاکے رکھے۔ ان میں بھُورے رنگ کا سیال تھا۔ جو شراب سے زیادہ گھوڑے کے پیشاب سے مشابہت رکھتا تھا اور اُن کے اندر زیتون کا ایک میوہ پڑا ہوا تھا۔ اس امریکی کاک ٹیل کا ذائقہ کڑوا میٹھا نمکسا متلی آمیز تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کاک ٹیل ہانولولو میں جنگلی کھوپرے کو سُور کے گوشت میں سڑا کے تیار کی گئی ہے۔ میں نے منہ کا مزہ بدلنے کے

لئے زیتون کا میوہ اُٹھا کے منہ میں رکھا۔ اف، کس قدر تیز، تیکھا، ترش سرکے کی طرح زبان کو کاٹتا ہوا تھا۔

"ارے لونچڑ! یہ کاک ٹیل ہے یا تیزاب ہے!" میں نے جھلا کے کہا۔ مگر لونچڑ بڑے مزے سے چسکیاں لے لے کر کاک ٹیل پی رہا ہے۔ اور باتیں کرتا جا رہا تھا۔ دو تین کاک ٹیل پینے کے بعد اس کی حالت عجیب ہو گئی اور اُس کی نگاہیں بار بار دم کی منقش چھت پر گڑ گئیں اور وہ اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

"ہائے مجھے امریکہ کے ہاٹ ڈاگز "گرم کُتے" یاد آتے ہیں۔"

"گرم کُتے کیا ہوتے ہیں، عجیب سا نام ہے؟ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "امریکہ میں گرم کتے ایک طرح کے کباب کو کہتے ہیں۔

"اور امریکہ میں گرم کتوں کو کیا کہتے ہیں؟" میں نے پھر پوچھا۔

اس نے مجھے گھُور کر دیکھا۔ پھر نگاہیں چھت پر گاڑ دیں۔

"ہائے مجھے "ہیم برگر" یاد آتے ہیں۔"

"یہ کیا بلا ہے؟" میں پھر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ لونچڑ تشریح کرنے لگا۔ دس منٹ کی لمبی تشریح کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہیم برگر میں تلی ہوئی مچھلیاں بیچی جاتی ہیں۔ میں نے جل بھُن کے کہا۔

"سالے — تو اس کے لئے امریکہ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں ہر گھر میں ہیم برگر ہے۔"

وہ بولا۔ "ہائے وہ بیس بال؟"

"یہ کیا ہوتا ہے؟"

بیس منٹ کی تشریح کے بعد پتہ چلا کہ امریکی بیس بال ویسی ہی ہے جیسے ہم لوگ بچپن میں لکڑ ڈنڈا کے نام سے کھیلتے تھے۔ ہمالیہ کے دامن میں امریکہ سے بہت دُور آج سے ہزاروں برس پہلے

سے ہمارے بزرگ کھیلتے آئے ہیں۔ بیس بال! ہونہہ؟

"اور نیک انگ پارٹی۔"

"وہ کیا؟"

ونچرڈ کی آنکھیں خوابیدہ ہوگئیں۔ وہ بولا "نیک انگ پارٹی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس پارٹی میں کوئی خاوند اپنی بیوی کے پاس نہیں بیٹھے گا۔ اور بیوی ہمیشہ اُس پارٹی میں کسی دوسرے کی آغوش میں بیٹھے گی۔ بوائے، او بوائے۔ مجھے سِن سناٹی کی وہ پارٹی یاد آتی ہے —" وہ اپنی یادوں میں کھو گیا۔ گرم کُتّے اور گرم عورتیں۔ خالی بوتلیں اور خالی دماغ — یکایک مجھے متلی سی ہونے لگی۔ میں نے پوچھا —

"تم نے امریکہ میں اور کچھ نہیں دیکھا —؟"

وہ بولا — "کیا؟"

"ہاورڈ فاسٹ کو دیکھا تھا؟"

"کون؟"

"پال رابسن؟"

"کون؟"

"والٹ وٹمین کی شاعری سُنی یا پڑھی تھی۔ بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا تھا —؟"

جگ موہن نے کہا "میں سٹیٹس میں اِن فضول باتوں کے لئے نہیں گیا تھا۔" میرا غصّہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے ونچرڈ کی ٹائی پکڑ کے کہا — "اور تم امریکہ سے یہ ٹائی لائے ہو جس کے ایک طرف مے خواری ہے اور دوسری طرف عریاں رقص ہے۔ ایک طرف قمار بازی ہے اور دُوسری طرف عصمت فروشی ہے ایک طرف ٹرومین ہے دوسری طرف ایٹم بم ہے۔ لیکن یہ تمہارا امریکہ ہے دوست،

میرا امریکہ ایسی ٹائی نہیں ہے۔ میرا امریکہ تو ایسی ٹائی ہے۔ جس کے ایک طرف اگر ابراہام لنکن ہے تو دوسری طرف محنت کرنے والا حبشی ہے۔ جس کے ایک طرف وائٹ وٹمین ہے تو دوسری طرف امریکی جہازی ہے۔ ایک طرف بچے سے محبت کرنے والا باپ ہے تو دوسری طرف خاوند کی وفادار بیوی ہے۔ ایک طرف پیک مُسکل کی جانبازی ہے تو دوسری طرف امن کی فاختہ ہے! میں اسی ٹائی کو ہمیشہ اپنے گلے میں پہنتا ہوں۔ اور اسے سو بار بوسہ دیتا ہوں!“

اُس نے اپنی ٹائی چھڑاتے ہوئے کہا ”تم ہمیشہ سے ویسے کے ویسے ہی سیاسی بُدھو رہے۔“ اور اُس نے پھر اپنی نگاہیں میری طرف سے ہٹا کر بار کی چھت پر گڑا دیں۔ اور ملامت بار لہجے میں بولا ”ہائے اس ویران مُلک میں کتنی گھٹن ہے۔ کاش میں پھر واپس امریکہ جا سکتا۔“

”کاش تم جا سکتے!“ میں نے دلی خلوص اور نفرت سے کہا۔

”مگر اب کے کونسی ٹریننگ حاصل کروں؟“ وہ میری نفرت نہ سمجھ کر بڑی بے صبری سے مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”وظیفہ تو میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر لوں گا۔“

”اب کے تم انسانی کھوپڑیوں کا تیل نکالنے کی ٹریننگ حاصل کرنا۔ اس کے لئے تمہیں وظیفہ بھی مل جائے گا۔ اور پھر امریکی صاحب اقتدار طبقے نے اس کے لئے بڑی آسانیاں بہم پہنچا رکھی ہیں۔“

اتنا کہہ کے میں اس کی میز سے اُٹھا اور باہر چلا گیا۔

ونچرڑ چند لمحے ہکا بکا میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اسے اپنے سامنے ایک پرتگیزی حسینہ نظر آئی جو اپنی سیٹ پر بیٹھی بیٹھی بینڈ کی گت پر تال دیئے جا رہی تھی۔ اُس کی ٹانگیں بڑی خوبصورت تھیں۔

ونچرڑ نے بڑے زور سے ـ

”ہنی!“

کہا اور اپنی ٹائی کا رُخ بدلنے میں مصروف ہو گیا۔

چھڑی

میں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "میری چھڑی نکالو۔ میں سیر کے لئے جا رہا ہوں!"

میرا بیٹا میرے کمرے کے اندر گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے چھڑی کا ایک سرا نکالا۔ دوسرا سرا نکالنے میں اسے کئی برس لگ گئے کیونکہ چھڑی بہت لمبی تھی۔ چھڑی نکالتے نکالتے اُس کے سر کے بال سفید ہونے لگے۔

آخرکار وہ چھڑی کا دوسرا سرا نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ چھڑی میرے ہاتھ میں تھما کر اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ پوچھنے لگا:

"کہاں جاؤ گے؟"

"ایک لمبی سیر کو جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

جب وہ مجھے سڑک پر اکیلا چھوڑ کر گھر کے اندر واپس چلا گیا تو میں نے سڑک کو دیکھا، پھر

سڑک پر پڑی ہوئی اپنی چھڑی کو دیکھا۔ چھڑی سڑک سے زیادہ لمبی تھی اور میں لمبی سیر کو جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں سڑک پر چلنے کی بجائے چھڑی کے اندر چلا گیا۔ میلوں اندر چلتا رہا۔ دور تک چلتا گیا۔ مٹیالی چوبی سڑک تھی۔ پرانی یادوں کی طرح کوئی آسمان نہ تھا۔ محض ایک گونج تھی۔ اور جتنے مسافر تھے سب اپنی قبریں ساتھ لئے چل رہے تھے۔ اور کوئی کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس جتنی زبانیں تھیں وہ انہوں نے اپنی آنکھوں کو دے دی تھیں اور اب گونگے ہو گئے تھے۔ اور گونگے ہونے سے پہلے اُن میں سے ہر شخص کے پاس چار زبانیں تھیں: ایک زبان سچ بولنے کے لئے، دوسری جھوٹ بولنے کے لئے، تیسری باہر کی دنیا کے لئے، چوتھی اندر کی دنیا کے لئے۔ مگر اب وہ سب گونگے تھے۔ صرف آنکھوں میں شاعری تھی اندھوں کی، اور ماتھے پر کفن تھا کسی پرانی سوچ کا۔ اور اب وہ چل رہے تھے۔ اور جو قدم وہ آگے کو بڑھاتے تھے پیچھے کو جاتا تھا۔

چلتے چلتے جب میں تھک گیا۔ اور راستہ ختم نہ ہوا تو میں نے اپنے دانت نکال کر اپنے پیروں میں نعل کی طرح لگا لئے۔ پھر میں نے اپنے ماتھے سے دونوں آنکھیں نکال کر اپنے پیروں کو دے دیں تو وہ ایک دم بہت تیزی سے چلنے لگے۔ چلتے چلتے یک لخت چوبی سڑک ختم ہو گئی اور لکڑی کا ایک زینہ شروع ہوا۔ برسوں میں اس لکڑی کے زینے پر چڑھتا رہا۔ آخر کار وہ زینہ ختم ہوا اور ایک چھوٹا سا برآمدہ نظر آیا۔ برآمدے کے پیچھے ایک گھر کا دروازہ نظر آیا جس پر ایک اجنبی عورت کھڑی تھی، آنکھوں میں مجبوری کی چتا جلائے ہوئے اور سر کے بال فرض کی طرح باندھے ہوئے! مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی:

"کہاں چلے گئے تھے؟"

"تم کون ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں تمہاری بیوی ہوں۔" وہ بولی۔

"مگر میں تمہیں نہیں جانتا۔"

"میں بھی تمہیں نہیں جانتی۔" وہ بولی "مگر تم میرے خاوند ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"کل کو کہو گے یہ بچے بھی جھوٹ ہیں۔" وہ جلدی سے اپنے بچوں کو آواز دے کر بلا لائی۔ بچوں کو دکھا کر بولی "یہ سب تمہارے بچے ہیں۔" کل گیارہ بچے تھے۔

میں نے حیرت سے اُن بچوں کو دیکھا "یہ سب بچے میرے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ڈیڈی!" وہ سب خوشی سے چلائے۔

میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں ملیں۔

"ہو نہیں سکتا۔" میں نے اس اجنبی عورت سے کہا جو میری بیوی تھی "میں تمہیں نہیں جانتا۔ اس لئے یہ بچے میرے نہیں ہو سکتے۔ البتہ شادی کا میں نے ایک دفعہ ضرور سوچا تھا اور بچوں کا بھی۔ لیکن صرف دو بچے سوچے تھے۔ یہ گیارہ کیسے ہو گئے؟ اس لئے میں واپس جاتا ہوں۔"

میں زینے سے نیچے اُترنے لگا تو وہ عورت شور مچانے لگی۔ بچے رونے لگے۔ یہ واویلا سن کر بہت سے پڑوسی اپنے گھروں سے نکل آئے اور بہت لعنت ملامت کرنے لگے۔ سب نے کہا "یہ تمہارے بچے ہیں۔ تمہاری بیوی ہے۔"

میں نے کہا "ہو سکتا ہے۔ تو پھر میں میں نہیں ہوں، کوئی اور ہوں۔"

اس پر انہوں نے مجھے میرے باپ کا نام بتایا جو صحیح تھا۔ میرے دادا کا نام جو صحیح تھا۔ میرے پردادا کا نام جو صحیح نہیں تھا کیونکہ وہ خود بھی صحیح نہیں تھا۔ اس پر مجھے یقین آگیا اور میں اس اجنبی عورت کا ہاتھ تھام کے گیارہ بچوں کے ساتھ گھر کے اندر چلا گیا اور گیارہ سال وہاں رہا اور جب

گیارہ سال گذر گئے تو میں نے پھر چلنے کی ٹھانی اور ایک بچے سے کہا کہ وہ میری چھڑی نکال لائے۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میری بیوی نے گھبرا کے پوچھا۔

"آزادی ڈھونڈنے!" میں نے جواب دیا۔

اس پر وہ رونے لگی۔ بچے چھڑی نکالنے لگے مگر گیارہ برسوں میں چھڑی اور بھی لمبی ہو گئی تھی۔ اس لئے چھڑی نکالتے نکالتے کئی برس گزر گئے اور آخر کار میں نے چھڑی ہات میں لے کر سب کو الوداع کہی اور زینہ اُتر کے سڑک پر چلنے لگا۔ جہاں قدم قدم پر صلیبیں گڑی تھیں اور چتائیں جل رہی تھیں اور آسمان کی جگہ گہری مایوسی کا کہرا چھایا ہوا تھا۔

چلتے چلتے آخر کار سڑک ختم ہو گئی اور جہاں پر سڑک ختم ہوتی تھی وہاں پر سلاخوں والا ایک بہت بڑا پھاٹک نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھاٹک آپ ہی آپ کھل گیا اور جب میں پھاٹک کے اندر گیا تو مجھے ایک قوی ہیکل دیوزاد آدمی ملا۔ اُس نے میرے ہات میں ہتھکڑی پہنا دی اور پاؤں میں بیڑیاں اور بولا:

"آزادی مبارک!"

"آزادی مبارک!" میں نے جواب دیا۔

پھر میں نے اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیوں کو دیکھا اور اس سے پوچھا:

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

وہ بولا "یہ آزادی کا جیل خانہ ہے!"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ جیل خانہ بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا جتنا کوئی ملک ہو سکتا ہے۔ اور اس میں ہزاروں لاکھوں غالباً کروڑوں آدمی کام کرتے تھے ہر روز دس بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد پورے ایک ماہ کے بعد اس قوی ہیکل آدمی نے مجھے اپنے آفس میں بلایا۔

وہ ایک میز کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ہات میں میری لمبی چھڑی تھی اور میز پر ایک بڑا کیک رکھا تھا۔ اس آدمی نے مجھے دیکھ کر میز کے قریب آنے کی دعوت دی۔ چھڑی لے کر کیک کاٹا اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا میرے ہات میں دے دیا۔ پھر دوسری بار ایک بہت بڑا ٹکڑا کاٹا اور اسے اپنے ہات میں لے کر کھانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے اپنے ہات میں کیک کے چھوٹے سے ٹکڑے کو دیکھ کر کہا۔

"آزادی کا ٹکڑا ہے!"

"مگر تمہارا ٹکڑا مجھ سے بڑا کیوں ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"کیوں کہ میں تمہیں آزادی دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے!" میں نے اس سے کہا۔ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس لئے میں اپنا چھوٹا سا ٹکڑا لے کر چلا گیا۔

برسوں تک ایسا ہی ہوتا رہا۔ ایک چھوٹا ٹکڑا میرے لئے ایک بڑا ٹکڑا اس کے لئے۔ آخر ایک دن میں چند تبدیلیوں کو لے کر اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہنے لگا:

"سب کے سامنے کیک کاٹو۔"

اس نے بڑی دلچسپی سے کیک کاٹا۔ ہمارے لئے ایک چھوٹا ٹکڑا کاٹا۔ اپنے لئے ایک بہت بڑا ٹکڑا لیا۔ اور اسے لے کر خوشی خوشی سے ہمارے ہی سامنے کھانے لگا۔

میں نے کہا: "تم بڑا ٹکڑا لیتے ہو۔ ہمیں چھوٹا دیتے ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

وہ بولا "کیوں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔"

میں نے پھر اس سے کہا: تمہارا خیال ہے تمہارا ٹکڑا سب سے بڑا ہے؟"

"اس میں کیا شبہ ہے؟" اس نے اپنا ٹکڑا دور سے دکھا کر کہا۔

"دیکھ لو۔"

"شاید تم گنتی نہیں جانتے!" میں نے کہا۔

"جانتا ہوں۔"

"تو بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟"

"چار روپے!"

"احمق ہے۔" میں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔ "یہ کہتا ہے۔ دو اور دو چار روپے ہوتے ہیں حالاں کہ دو اور دو چار آدمی ہوتے ہیں۔"

میرے ساتھی زور زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی سن کر وہ خوف سے لرزنے لگا، پھر مایوسی سے رونے لگا۔ اس پر میرے ساتھی اتنے زور سے ہنسے کہ ان کا قہقہہ ایک گولے کی طرح پھٹا اور چاروں طرف دھواں پھیل گیا۔ جب دھواں صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ جیل خانہ ہے نہ اس کی دیواریں ہیں نہ وہ لوگ ہیں۔ میرے ہاتھ میں میری چھڑی ہے جو دو تہائی سے زیادہ جل چکی ہے اور اب وزن میں بہت ہلکی ہو چکی ہے۔

میں چھڑی ہلاتا ہوا آگے بڑھا تو مجھے ایک اونچے ٹیلے پر ایک بڈھی عورت ایک سنہرے گولے کو اپنی گود میں لئے کچھ بننے میں مصروف نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر بڑی محبت اور شفقت سے مسکرائی جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو — مگر میں اُسے نہیں جانتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے اس بڈھی عورت سے پوچھا۔

"میں سورج ہوں۔" وہ بولی۔

"مگر سورج تو باپ ہوتا ہے۔"

"نہیں۔" وہ بڑے پیار سے سر ہلا کر بولی۔ "جو جسم دے وہ ماں ہوتی ہے۔ میں نے اپنی کوکھ

سے تمہارے لئے زمین کو جنا اور زمین نے تمہیں ۔ اس لئے تم میرے پوتے ہو۔"

میں نے اس کے پاؤں چھوئے اور پوچھا: دادی اماں! تم اس ٹیلے پر بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

"آؤ اس ٹیلے پر چڑھ کے دیکھو۔" وہ بولی۔

جب میں ٹیلے پر چڑھ گیا اور جا کے دادی اماں کے قریب کھڑا ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ جس ٹیلے پر دادی اماں بیٹھی ہیں اس کی بالکل مخالف سمت پر دوسری طرف ایک اور اونچا ٹیلا ہے اور اس ٹیلے کے درمیان ایک قعر فنا ہے اور یہاں سے وہاں تک جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر دادی ماں کی گود میں رکھے ہوئے سنہری گولے سے جو تار نکلتے انہوں نے اس قعر فنا کے اوپر سنہری کرنوں کا ایک جال بُن دیا ہے اور اس سنہرے جال کے نیچے ایک خوبصورت پل ہے جس کی سات محرابیں دھنک کے سات رنگوں سے بنتی ہیں۔ ایسا خوبصورت پل میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

میں نے اس پل کی طرف حسرت اور مسرت سے دیکھتے ہوئے کہا:

"کیا میں اس پل پر چل سکتا ہوں؟"

وہ بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: یہ پل تو ہمیشہ تمہارے قدموں کے نیچے تھا۔ حیرت ہے تم نے آج تک اسے نہیں دیکھا۔"

میں نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر دادی ماں کے پاؤں پھر چھوئے اور پل پر آگے بڑھ گیا۔ پل پر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنا قدم کسی جھولے پر رکھ دیا ہو۔ بڑے مزے میں چلتا کسی طرح کی تکلیف کو محسوس کئے بغیر جب میں پل کو دو تہائی کے قریب پار کر گیا تو مجھے وہاں پر ایک چھوٹا سا لڑکا کھیلتا نظر آیا۔ میں اُس کی طرف غور سے دیکھنے لگا کیونکہ اس کی شکل مجھ سے کچھ ملتی جلتی تھی۔

"کیا تم میرے بیٹے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ بولا: "نہیں میں تمہارا پوتا ہوں۔"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"کیوں؟"

"مجھے تمہاری چھڑی چاہیے۔"

"اس چھڑی کو لے کر اب تم کیا کرو گے؟ یہ چھڑی بہت سی ٹوٹ چکی ہے۔ بہت سی جل چکی ہے۔ اس چھڑی نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ تم اس چھڑی کو لے کر کیا کرو گے؟"

وہ بولا: "تم صرف اس کے سہارے زندگی بھر چلتے رہے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی تھی۔ مگر میں یہ غلطی نہیں کروں گا۔"

"پھر تم اس چھڑی کو لے کر کیا کرو گے؟" میں نے حیران ہو کر اُس سے پوچھا۔

"میں اس چھڑی کو ایک ڈائیونگ بورڈ کی طرح استعمال کروں گا۔ اُسے پُل پر کھڑا کر کے اس پر سے چھلانگ لگا کر نیچے سمندر میں کود جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ قدرت نے صرف زندگی اور موت بنائی ہے لیکن جست صرف انسان نے لگائی ہے۔"

میں حیرت سے اس بچّے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا پوتا جو سورج کی طرح عقل مند تھا۔ میں نے چھڑی اس کے ہات میں دے دی۔ اُس نے چھڑی لے لی۔ اسے پُل کے کنارے سنہری کرنوں کے تاروں میں اُلجھا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اُچک کر اس کی موٹھ پہ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہات بلند کر کے اُس نے ہوا میں چھلانگ دی۔ دُور تک اُس کی ہنسی کے قہقہے بکھرتے گئے۔ پل ڈولنے لگا۔ پھر ہر محراب لچک کر ناچنے لگی۔ پھر ساتوں محرابوں کے ساتوں رنگ سات خوشبوؤں والے پیانو کی طرح گونجنے لگے۔

پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا وزن کم ہو رہا ہے۔ میرا جسم ہوا سے بھی نرم اور لطیف بنتا جا رہا

ہے۔ خوف اور مسرت کے ملے جلے احساس سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

پھر جب میں نے آنکھ کھولی تو میں نے دیکھا کہ میں نہ تھا۔ صرف فضا میں کہیں پر ایک رنگ سا تھرتھرا رہا تھا اور ایک سُر سا بج رہا تھا۔!

چور

وہ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے اُسے دیکھ کر انتہائی کراہت محسوس ہوئی۔ میلی جیکٹ قمیض، گندی تار تار پتلون، جگہ جگہ مٹی کے دھبے، جیسے وہ عرصے سے اس پتلون میں زمین پر سوتا رہا ہے۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور رخسار اندر کو پچک گئے تھے۔ اور آنکھوں میں ایک غیر معمولی غیر صحت مند چمک تھی۔ جیسے وہ آنکھیں ہانپ رہی ہوں۔ جیسے ایک جنگل ہو۔ چاروں طرف بھیڑیے ہوں۔ اور بیچ میں ایک ہرن ہو۔ ہرن تو بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ مگر اس آدمی میں خوب صورتی، نرمی، ملائمت نام کو نہ تھی۔ اس کی سُوکھی دُبلی پتلی گردن پر میل کی، اتنی پرانی تہیں جمی تھیں کہ انہیں کھُرچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ممکن ہے میل نے جلد کو کھا لیا ہو۔ جیسے زنگ لوہے کو کھا ڈالتا ہے۔ آپ نے میل کو ناخن سے ذرا سا کھُرچا اور اندر سے جلد کے بجائے خون نکل آیا۔ کچھ ایسا احساس مجھے اس کی گردن چہرے اور باہنوں پر میل کی تہوں کو دیکھ کر ہوا۔ اور میں ذرا سکڑ

کر بس کی کھڑکی سے جا لگا۔ کیا حرج تھا، اگر وہ لیمور رنگ، ٹافیٹا کا فراک پہنے ہوئی خوبصورت لڑکی میرے پاس بیٹھ جاتی۔ یا وہ نائی لان ساڑھی سے چھن کر نظر آنے والی عورت، جیسے چھنتی ہوئی بدلی میں ماہتاب، اس سے تو آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں دینی اور دماغ میں چابیوں کا گچھا چھپائے ہوئے وہ گجراتی لڑکی ہی بہتر تھی۔ جیسے میں نے کسی بہتر حسن کی تلاش میں اپنے دل ہی دل میں رد کر دیا تھا۔ یکایک ڈاڑھی بڑھائے ہوئے دُبلا پتلا آدمی زور سے کھانسا۔ اور چونکہ میں کھڑکی کیطرف تھا، بلکہ کھڑکی میری طرف تھی اس لئے وہ کھڑکی سے باہر تھوکنے کے لئے میری جانب جھکا۔ اور تھوک کر جب واپس لوٹا۔ اور مجھے اس کے جسم پر سے کہیں سے کپڑے کے چھرانے کی آواز آئی۔ اور پھر مُڑ کر جب میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ تو معلوم ہوا کہ جہاں جہاں اس کا کپڑا میرے بدن کے کپڑوں سے چھو گیا تھا، غلاظت کی دھاریاں بناتا چلا گیا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میری قمیض سپید براق تھی۔ اور اب دھاری دار، ایک لمحہ پہلے میری پتلون کریم رنگ اور امریکی شارک سکن کی تھی اب بھورے کھدر کی۔ ایک غریب آدمی ساری بس کو کیسے گندہ کرتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہی ہوا۔ آخر یہ گورنمنٹ غریب آدمیوں کے لئے الگ بسیں کیوں نہیں چلواتی؟ کس لئے ہم سے سپر انکم ٹیکس لیتی ہے؟

میں نے ذرا گھور کر اس مفلس آدمی کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب میں اور بھی زیادہ گھور کر میری طرف دیکھا۔ اور اس کی آنکھوں کی خشمگیں چمک اور ابھر آئی۔ اور پتلی گردن کا حلقوم اوپر نیچے حرکت کرنے لگا۔ اتنے میں بس کنڈکٹر قریب آیا۔ دُبلے پتلے چمرخ نے اپنی پتلون کی جیب سے ٹٹول ٹٹول کر ایک اکنی نکالی اور اندھیری کا ٹکٹ لے لیا۔ یہ اندھیرا اندھیری تک میرے ساتھ رہے گا۔ ؟ کم بخت! اسے میری سیٹ پر ہی بیٹھنا تھا؟ کتنی خوب صورت بس ہے۔ جٹ کے سے نازک خطوط اور اس طرح سبک رفتار، سبز رنگ سیٹیں اور نیلے رنگ کی دیواریں اور سپید روشنی کی ٹیوبیں، جن سے ٹافیٹا کا بھورا رنگ اور نائی لان کا شفاف پن اور لپ اسٹک کا گہرا سرخ رنگ

چمک اٹھتا ہے۔ اس بس میں ایسا آدمی میرے پاس بیٹھا ہے! مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے فٹ پاتھ سے کوڑا کرکٹ اٹھا کے میری سیٹ پر ڈال دیا ہو۔ انتہائی بدمذاقی ہے یہ بھو!

میری مصیبت یہ ہے۔ کہ میں ایک خوش ذوق آدمی ہوں۔ میں گاڑیوں میں کیڈی لیک کو کپڑوں میں شارک سکن کو اور ادب میں دوامی قدروں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر یہ زندگی، یہ دنیا ایسی ہے کہ اکثر میرے جذبات مجروح کرتی رہتی ہے۔ اب کیا کیا جائے۔ میں نے اپنی گود میں لیٹی ہوئی کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اور اس کے صفحات میں پناہ چاہی۔ یہ ایک خوبصورت فرانسیسی ناول تھا۔ جس میں ایک بیٹی اپنے باپ کی محبوبہ سے رقابت کرتی ہے۔ اور ایسے اقدامات کرتی ہے۔ جس سے اس کے باپ کی محبوبہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

یعنی کس قدر زندگی کی ابدی قدروں سے بھرپور ناول تھا یہ۔ ابھی میں اس کے دو ایک صفحے ہی پڑھ سکا تھا۔ کہ اگلے بس اسٹاپ سے مسافروں کا ایک ریلا اندر آیا۔ اور بس اس کونے سے اس کونے تک کھڑے ہوئے زور زور سے باتیں کرنے والے مسافروں سے بھر گئی۔ میں نے گھبرا کر کتاب بند کر دی۔ یہ کتاب پڑھنے بھی نہ دیں گے اب تو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ کہ چلو زندگی کی چلتی پھرتی عارضی قدروں ہی سے دل بہلا لیا جائے۔

بے چارہ بس کنڈکٹر جلدی جلدی اپنے مسافروں کو بھگتانے میں مصروف تھا۔ پیسے لے رہا تھا، ٹکٹیں کاٹ رہا تھا اور پیسے دے رہا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے بس سٹاپ پر غصے اور تیزی سے "جگہ نہیں ہے" کی گھنٹی بجانے میں مصروف تھا۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہو رہا تھا کہ سہارنپور یا میرٹھ کے علاقے کا ہے۔ اس کے سر کی ٹوپی ایک طرف کو کھسک گئی تھی اور چٹیا سر کے پیچھے چپکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خاکی کوٹ کے دو بٹن ندارد تھے۔ اور پتلون اس نے اس طرح پہن رکھی تھی جیسے سارنگی نے غلاف پہن رکھا ہو۔ مگر اسے دیکھ کر بالکل ہنسی نہیں آتی تھی۔ ہنسی کے لئے بھی

ایک خاص طرح کی لطافت چاہیئے۔ اُسے دیکھ کر بس ایک عجیب طرح کی مایوسی اور بدحواسی کا خیال آتا تھا۔ خیال آتا تھا کسی کھوئے ہوئے جانور کا، کسی گھرے ہوئے شکار کا، کسی سوکھے ہوئے درخت کا۔ کسی ناموزوں مصرعے کا، خیال آتا تھا، پت جھڑ میں اُڑ اُڑ کر گرتے ہوئے اُداس پتوں کا۔ جاڑے کی گہری کثیف رنجور بدلیوں کا، اُن بے کس جانوروں کا جو موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ مانگ کر کسی تپلے پیڑ کی چھدری چھاؤں تلے ہانپتے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ یہ بس کنڈکٹر بھی اس وقت اسی طرح ہانپ رہا تھا۔ پسینہ اس کے ماتھے سے گر رہا تھا۔ ہمارے پیچھے کی سیٹ پر دو نوجوان بیٹھے تھے ان میں سے ایک نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا اور دو ٹکٹ مانگے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے دو ٹکٹ کاٹ کے ان کے حوالے کئے۔ اور جب اس لڑکے نے باقی پیسے مانگے تو کہا ابھی دیتا ہوں۔ اور جلدی سے ان دو آدمیوں کے ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ جو اگلے سٹاپ پر دروازے سے باہر جانے والے تھے۔ اچھا ہوا اس نے اُنہیں روک کر ٹکٹ دے دیئے۔ ورنہ وہ تو مفت کی سواری کر گئے تھے۔ وہاں سے بے چارہ بس کنڈکٹر جو لوٹا تو اُسے ایک موٹے سندھی نے گھیر لیا۔ اور اسے دو روپے دیئے اور دو آنے کا ٹکٹ مانگا۔ اتنے میں اگلا بس سٹاپ آگیا۔ اور بس کنڈکٹر جلدی سے سب کام چھوڑ کر بس کے دروازے پر لپکا۔ کہ لوگوں کو اندر آنے سے روکے۔ کیونکہ بس بھر چکی تھی۔ یہاں پھر دو آدمی اُتر گئے۔ اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک بچے کو انگلی سے لگائے اندر داخل ہوئی۔ عورت چونکہ بھدی، موٹی اور بدصورت تھی۔ اس لئے بس میں کوئی مرد اپنی جگہ سے اٹھ کر اُسے سیٹ دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ نہ ہی کسی نے اس کے بدصورت بچے سے پیار کیا۔ اگر اس کی جگہ کوئی خوبصورت عورت ہوتی۔ یعنی زندگی کی دوامی قدر ہوتی۔ تو چار چھ لوگ اس کے اندر آتے ہی اپنی سیٹ اس کے لئے خالی کر دیتے۔ پھر وہ ایک جگہ بیٹھ جاتی تو کوئی اس کے بچے کو اپنی گود میں لے لیتا۔ ارے کس قدر پیارا بچہ ہے۔ اُسے چومتا چاٹتا۔ لالی پاپ اور اس طرح کا پیار ظاہر کرتا

جیسے دراصل وہی اس بچے کا باپ ہے۔ کئی لوگ تو اس موقعے پر بچے کو گود میں لئے وہیں اتر جاتے ہیں جہاں اس عورت کو اترنا ہوتا ہے۔ اور باتیں کرتے ہوئے بچے اور اس کی ماں کو گھر تک پہنچا کے آتے ہیں اور اگلے دن کی دعوت قبول کر کے آتے ہیں۔ مگر یہاں تو کچھ نہ ہوا۔ بدصورت عورت بدصورت بچہ۔ دونوں بھیڑ میں کھڑے رہے اور دوسرے مسافروں کے دھکے کھاتے رہے۔ بس کنڈکٹر نے لوٹ کر موٹے سندھی کو ایک روپیہ بارہ آنے دیئے۔ اس بدصورت عورت اور اس کے بچے کا ٹکٹ کاٹا۔ پھر اُسے یکایک خیال آیا کہ اسے کسی اور آدمی نے بھی روپیہ دیا تھا۔ اور اس میں سے اُسے تیرہ آنے واپس کرنے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سوکھے پتلے چمرخ آدمی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک لمحے کے لئے چمرخ آدمی کی آنکھوں میں حیرت جھلکی پھر غائب ہوگئی۔ دوسرے لمحے میں اس کے ہات نے زور سے اُن تیرہ آنوں کو اپنی مٹھی میں چھپا لیا۔ اب مٹھی اس کی پتلون کی جیب میں چلی گئی تھی۔ اور وہ تن کر سیدھا بیٹھ گیا۔ اور اپنے بالکل سامنے دیکھنے لگا، جیسے اسے اس پورے واقعے سے کوئی تعلق نہ ہو۔

پچھلی سیٹ کے دونوں نوجوان لیمو رنگ ٹا فیٹا کے فراک کو تعریفی نگاہوں سے تک رہے تھے کب سے تک رہے تھے۔ کیسی خوبصورتی تھی ان کی آنکھوں میں! کتنے ہی پھول کھلے تھے۔ کتنی ہی بہاریں آئی تھیں، کتنے ہی آبشار گائے تھے۔ آرزوؤں کے کتنے ہی سمندر۔ خوشبوؤں کے کتنے ہی پھول کھلے، خوابوں کے کتنے ہی سنہرے جال اُن آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ یہ آنکھیں جو دیکھتی ہیں، سنتی ہیں، بولتی ہیں۔ اور انسانوں کے دل کی طرح دھڑکتی ہیں۔ ان چاہنے والی آنکھوں کی خوبصورتی کا جواب کس حسن کی رعنائی میں ہے؟ ان دونوں نوجوانوں نے اپنے تیرہ آنوں کو کسی دوسرے کی جیب میں جاتے ہوئے نہ دیکھا۔ کیونکہ اس وقت ان کی آنکھیں وہ دیکھ

رہی تھیں جو تیرہ آنے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ روپیہ بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن وہ انسان کی آنکھ تو نہیں ہے۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحے کے حسن نے کیا۔ دوسرے لمحے میں وہ لیمو رنگ ٹافیٹا فراک والی عورت اپنی سیٹ سے اٹھی اور خراماں دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس کے ریشم کی سرسراہٹ ایک اُداس خوشبو کی طرح بس میں بکھر گئی۔ اک شفق کی طرح چاروں طرف کھل اُٹھی۔ دوسرے لمحے میں سورج ڈوب گیا۔ اور بس میں تاریکی چھا گئی۔ کم از کم اِن دونوں نوجوانوں کو ایسا ہی محسوس ہوا۔ ان کی نگاہوں میں رات چھا گئی چند لمحوں کے لئے ......

لیکن جب رات آئی تو یاد آئی۔ اور جس نوجوان نے کنڈکٹر کو ایک روپیہ دیا تھا، اُسے اپنے تیرہ آنے یاد آئے۔ جو اُسے بس کنڈکٹر سے وصول کرنے تھے۔ یونہی ہوتا ہے۔ اس زندگی میں یونہی ہوتا ہے۔ جب خوب صورتی چلی جاتی ہے۔ تو روپیہ یاد آتا ہے۔ جب محبت چلی جاتی ہے تو انتقام یاد آتا ہے۔ جب شباب گزر جاتا ہے۔ تو اخلاق سر اٹھانے لگتا ہے۔ جب زندگی سے اچھی چیزیں نکل جائیں تو صرف کمینہ حرکتیں باقی رہ جاتی ہیں ـــ اے میری پیاری لیمن ٹافیٹا۔ تو کیوں اس بس سے چلی گئی۔ اگر تو نہ جاتی تو پھر وہ تو نہ ہوتا جو اب ہوا۔ جو پہلے بھی ہوا تھا۔ جو آگے بھی ہوگا۔ تو کیوں نہ اس بس میں آ کے بس گئی۔ تو نے کیوں نہ اس سے دوامی پیار کر لیا۔ اے میرے ابدی حسن، تو کیوں اک لمحے کی طرح آیا اور اک چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔

اے میاں افسانہ نویس! یہ کیا بکواس ہے۔ میں تمہاری پیاری لیمن ٹافیٹا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ لیمن ٹافیٹا ہے اصل میں اس کا نام جوزلیفائن گکریٹیا ہے۔ یہ باندرے کی رہنے والی ہے اس کا باپ غیر قانونی طور پر شراب بیچتا ہے۔ دو مرتبہ یہ جیل جا چکی ہے۔ ایک مرتبہ بچہ نکلوا چکی ہے۔ دس تو اس کے عاشق ہیں۔ یہ پاپولر ڈانسنگ ہال میں ناچ سکھاتی ہے اور امیر سیٹھوں کے بے وقوف چھوکروں کو اپنے جال میں پھنساتی ہے۔ ہر وقت پیئے رہتی ہے۔ کچی پیاز کھانے کا

اسے اس قدر شوق ہے۔ اور تم اس کی خوشبوئیں بس میں بھر رہے ہو! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

ارے کچھ تو سچ بولو، میاں!

ارے رے رے تو کہاں سے آمرا۔ کم بخت۔ میرے چلتے ہوئے افسانے میں بریک لگا دی اُتر جا میرے بھائی اپنے افسانے کی بس سے اُتر جا۔ میں اگر سچ بولوں گا۔ تو ابدی قدروں والا۔ افسانہ کیسے لکھا جائے گا۔ وہ خوب صورت دھندلا دھندلا پن جیسے کچھ ہے اور کچھ نہیں بھی ہے، کچھ سمجھ میں آتا ہے۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں بھی آتا ہے۔ بلکہ اگر بالکل ہی نہیں آتا ہے۔ تو بہت ہی اچھا ہے۔ پھر میں وہ سب کہاں سے لاؤں گا۔ اُتر جا میرے پیارے۔ دیکھ۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے پڑھنے والوں کو ڈھرے پر لگایا ہے۔ تو نے آ کے سب گڑ بڑ گھٹالا کر دیا۔ کم بخت ..... گیٹ آؤٹ!

پیچھے کی کھڑکی پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے جس کا نام موتی تھا، اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اور پھر اپنے ساتھی سے پوچھا۔ گلشن تم نے باقی پیسے کنڈکٹر سے لئے۔

اب کے گلشن نے جیبیں ٹٹول کر کہا نہیں!

اچھی طرح سے یاد ہے۔

اس میں یاد کرنے کی کیا بات ہے۔ ہم دونوں اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔

اچھے موقعے پر یاد آیا۔ ورنہ روپیہ گُل تھا۔ اے مسٹر کنڈکٹر.....!

مگر اس موقعے پر پانچ چھ کنڈکٹر جو اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر جا رہے تھے سانتا کروز کے اڈے سے بس میں سوار ہو گئے۔ اور ان سب لوگوں میں باتیں ہونے لگیں، سہارنپوریا کنڈکٹر بے حد پریشان معلوم ہوتا تھا اس کی ماں بیمار تھی جیسا کہ اس کی گفتگو سے معلوم ہوا۔ اور تین چار روز سے وہ ایک دن کی چھٹی مانگ رہا تھا مگر اسے چھٹی نہیں مل رہی تھی، ڈاکٹروں نے جو دوا تجویز کی تھی۔ اس دوا

کے پیسے بھی اس کے پاس نہ تھے۔ بھلا سات روپے کی دوا میں کہاں سے لاؤں گا۔ سو روپیہ تو صرف اپنی پگار ہے سو روپوں میں بھی ہوتا کیا ہے۔ اس کے بعد اس نے سو روپے کا بجٹ گن کر سنایا۔ یہ مہینے کے آخری دن تھے، اور اس کی جیب بھی آخری لمحوں پہ تھی غریب آدمی کی جیب ہر مہینے مرتی ہے زندگی میں ایک دو بار مرنا تو اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن ہر ماہ مرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ زندگی سے مذاق معلوم ہوتا ہے، یہ لوگ جو سو روپیہ پانے والے تو تھے ہی۔ اور ان کی اپنی بڑی مضبوط یونین تھی۔ جو بہت سی باتیں منوا بھی لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اس قدر پریشان تھے، سہارنپوریئے کنڈکٹر نے بات کیا چھیڑی۔ گویا بھڑوں کا چھتہ چھیڑ دیا۔ سبھی کنڈکٹر الجھ پڑے اور کمپنی کو گالی دینے لگے۔ زندگی سے ماحول سے، مینجر سے، تم سے، مجھ سے شکایت کرنے لگے، کیسے ناشکرے لوگ ہیں یہ۔ میں نے انہیں دیکھ کر سوچا۔ انہیں کمپنی سے باقاعدہ تنخواہ ملتی ہے، وردی ملتی ہے، مہنگائی کا الاؤنس ملتا ہے چھٹی ملتی ہے اور کیا چاہیئے، انہیں؟ موت؟ ان مزدور لوگوں سے آپ جتنا اچھا سلوک کرنے جائیں۔ یہ اتنا ہی آپ کے سر چڑھتے جائیں گے۔ اُونہہ کمینے کہیں کے! وہ سہارنپوریا کنڈکٹر کہنے لگا۔ سچ جانو۔ جیب میں صرف ایک روپیہ پانچ آنے ہیں اب تم بتاؤ ایک روپیہ پانچ آنے میں سات روپے کے انجکشن کیسے آسکتے ہیں؟

اور ماں کی زندگی کا سوال ہے! کنڈکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اے مسٹر کنڈکٹر! ۔ موتی اپنی سیٹ سے پھر زور سے چلّایا۔ ذرا ادھر آنا بھائی!

کیا ہے؟

تم کو ایک روپیہ دیا تھا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ تم نے ہم کو دیا۔ ڈیڑھ آنے کا ٹکٹ اس کو دیا۔

دلکش کی طرف اشارہ کر کے، باقی تیرہ آنے لاؤ۔

تیرہ آنے تم کو نہیں دیئے؟ کنڈکٹر نے حیران ہو کر پوچھا۔

نہیں۔ اس وقت رش بہت تھا۔ تم نے کہا۔ ابھی دیتا ہوں۔ اب تک تو دیئے نہیں۔ تین چار سٹاپ گذر گئے۔ اب لاؤ!

یکایک بس کنڈکٹر کو کچھ یاد آیا۔ مگر اُسے یہ یاد نہ آیا کہ اُس نے کسے وہ پیسے دیئے ہیں۔ وہ بولا۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ میں نے تمہیں پیسے دیئے ہیں۔

اتنا کہہ کر اس نے گلشن کی طرف اشارہ کیا۔

گلشن نے سر ہلا کے کہا۔ تم نے مجھے پیسے نہیں دیئے۔

تو پھر میں نے تمہارے دوست کو دیئے ہوں گے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

تم نے مجھے بھی نہیں دیئے۔ موتی نے غصے سے چلا کے کہا۔

دو ایک اور بس کنڈکٹر آ گئے۔ بولے۔ صاحب اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ آپ اپنی جیب تو دیکھئے۔

یہ سُننا تھا کہ موتی اور گلشن دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے اپنی اپنی پتلون کی جیبیں نکال دیں۔ جیبیں خالی تھیں۔ گلشن نے ذرا اُداس لہجے میں کہا، ہم لوگوں نے نو بہار سٹوڈیو تک کا ٹکٹ لیا تھا۔ ہماری جیب میں صرف ہی ایک روپیہ تھا۔

یہ کہہ کر دونوں بیٹھ گئے۔ مجوب اور شرمندہ۔ جیسے بھری محفل میں کسی نے ان کی بے عزتی کی ہو۔ کیوں ان کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ اور چال ڈھال سے فلمی اکسٹرا معلوم ہوتے تھے، اگر دونوں کے کپڑے صاف ستھرے تھے، دونوں تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے، مگر بے کار۔ ان کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ ایک سو ہوتا، ایک ہزار ہوتا۔ ایک لاکھ ہوتا۔ تو کیا وہ اس طرح اپنے روپیہ کا مطالبہ کرتے، مگر اب وہ مجبور تھے، ایک ہی روپیہ تھا، اور رات کو نو بہار سٹوڈیو میں شوٹنگ تھی۔ اس ایک روپے میں دو آدمیوں کی چائے، پانامہ سگریٹ، کھانا۔

اور واپسی میں بس کا کرایہ، ایک ایک پائی زنجیر میں بندھی تھی۔ اِدھر سے اُدھر نہ جا سکتی تھی، یہ تیرہ آنے تو انہیں ملنے ہی چاہیئں۔

مگر میں تیرہ آنے دے چکا ہوں، بس کنڈکٹر نے جس کی ماں بیمار تھی۔ تقریباً روہانسا ہو کر کہا۔

کس کو دیئے تم نے؟ گلشن نے ذرا غصّے سے کہا۔

بس کنڈکٹر نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظر موٹے سندھی پر پڑی اُسے کچھ یاد آیا۔ شائد غلطی میں آپ کو دے گیا۔

غلطی میں نہیں تم نے ٹھیک دیئے، میں نے یہ ٹکٹ دو آنے کا خریدا۔ میں نے دو روپیہ دیا۔ تم نے ایک روپیہ چودہ آنے واپس کیا۔ اب مجھ سے کیوں جھگڑا ہے سائیں؟

بس کنڈکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا، وہ کس سے کیا کہے، میں غور سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ اپنی پتلون میں ہاتھ ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ ادھر دیکھ رہا تھا نہ اُدھر، جیسے اسے اس پورے واقعے سے کوئی سروکار نہ ہو، اس کے زرد رخسار اور زرد ہو گئے تھے اور ان کی کھال اور کھنچ گئی تھی، اس کی سانس تیزی سے آتی جاتی معلوم ہوتی تھی، اس کی آنکھوں کی چمک اس قدر بھوکی گرسنہ خشمگیں معلوم ہوتی تھی، وہ چمک گویا کہہ رہی تھی، یہ تیرہ آنے جو میری مٹھی میں ہیں، میری زندگی ہیں، یہ تیرہ آنے نہیں ہیں۔ زندگی کے تیرہ دن ہیں، تیرہ ماہ ہیں، تیرہ سال ہیں، تیرہ صدیاں ہیں میرے لئے سب کچھ ہیں۔ میں انہیں کبھی نہ دوں گا۔ کبھی نہ دوں گا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی مُٹھی پتلون کے اندر اور بھینچ گئی۔ اس کا نچلا جبڑا اس کے اوپر کے جبڑے سے اس زور سے لگ کر بند ہو گیا، گویا اب اُسے کسی پیچ کش ہی سے کھولا جا سکتا ہو۔

بس کنڈکٹر نے کہا۔ میں کہاں سے دوں، میں تو دے چکا۔ میرے پاس پہلے ہی سے پیسے نہیں تھے، اب کہاں سے دوں گا۔ اُسے اپنی ماں کے لئے دوا کا خیال آیا، اور وہ غصّے سے لال

ہو گیا، اس نے گلشن اور موتی کی طرف دیکھ کر کہا، آپ لوگوں نے پیسے کہیں گرا دیئے ہوں گے۔

گرا نہیں دیئے تھے، لاری سے باہر پھینک دیئے تھے، موتی نے طنزاً کہا، اب زیادہ باتیں نہ کرو، ہمیں ہمارے تیرہ آنے دے دو، تیرہ آنے ۔

ماں کی دوا کہاں سے آئے گی، صرف ایک روپیہ پانچ آنے تو میرے پاس ہیں، کنڈکٹر نے اپنے دل میں سوچا، اس میں سے تیرہ آنے گئے، تو پھر کیا بچا۔

تیرہ آنے!

رات بھر شوٹنگ کرو، اکسٹرا سپلائر کی گالیاں سنو، ڈائرکٹر کی جھڑکیاں۔ رت جگا، باسی چائے کینٹین کی دال۔ دال کم اور کنکر زیادہ، سگریٹ۔ پان، کیا ان سب کے لئے تیرہ آنے کافی ہوں گے کافی تو نہ ہوں گے، مگر یہ بھی نہ ملے، تو پھر کیا ہو گا؟

تیرہ آنے

کون کہتا ہے۔ تیرہ آنے ہمارے نہیں ہیں۔ میں جو آٹھ دن سے بھوکا ہوں۔ کہ دس دن سے بھوکا ہوں، کہ دس ماہ سے بھوکا ہوں، میں جو فٹ پاتھ پر سوتا رہا ہوں۔ اور مدہم مدہم آنچ کی طرح سلگنے والے بخار میں مبتلا ہوں، فٹ پاتھ جس کا بچھونا ہے، اور پولیس کے سنتری کی ٹھوکر جس کی قسمت ہے، میں تو تیرہ آنوں سے بہت دن زندہ رہ سکتا ہوں۔

یہ تیرہ آنے جو میری زندگی ہیں، اگر میرے نہیں ہیں، تو کس کے ہیں؟

یکا یک وہ تیرہ آنے گویا میرے لئے فضا میں اُچھلے، اور مجھ سے پوچھنے لگے ہم کس کے ہیں؟ ہم کس کے ہیں؟

اگر تم جانتے ہو، تو بتا دو، ہم کس کے ہیں؟

وہ تیرہ آنے جڑ کر بلیڈ کی دھار کی طرح تن گئے۔ کتنی ہی زندگیاں اس پر ناچ رہی تھیں، ایک

بس کنڈکٹر، ایک بھکاری دو بے کار!

صرف تیرہ آنے!

پانچ ہزار برس کا کلچر، اجنتا، ایلورا، بخشش، سخاوت، فیاضی، دریا دلی، دیا، دھرم، وسعت بلوغت، فکر، ثقافت، کلچرل ڈیلیگیشن، کتھاکلی، ابدی قدریں، اسلامی ادب، آریا سماجی ادب۔

جھنڈا اونچا رہے ہمارا!

صرف تیرہ آنے۔

بس کنڈکٹر کا چہرہ لٹک گیا۔ دھیرے دھیرے اُس نے اپنے چرمی تھیلے سے تیرہ آنے نکالے، جیسے وہ اپنی ماں کے آخری سانس گن رہا ہو۔

موتی نے وہ آنے جلدی سے جھٹک کر اپنی جیب میں رکھ لئے، وہ دونوں موتی اور گلشن اس طرح خلا میں دیکھنے لگے، جیسے بس میں ان کے سوا اور کوئی بیٹھا نہ ہو۔

میرے پاس بیٹھے ہوئے دُبلے پتلے آدمی نے زور کا سانس اندر کھینچا، اور پھر بالکل تن کر بیٹھ گیا۔ اس کے رخساروں کی رنگت بالکل سفید ہو گئی۔

میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، مجھے اُس سے سخت گھن آئی، چور یہ ہے، اور یہ صاف بچ کے نکلا جا رہا ہے، میرے دل میں آیا کہ میں اُسے چور کہہ دوں، میرا ایک لفظ اسے گرفتار کرا دینے کے لئے کافی تھا۔ مگر نہ جانے وہ لفظ میرے منہ سے کیوں نہ نکلا، میں چپ چاپ اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس واقعے کے بعد کسی نے بس میں کسی سے بات نہ کی۔ کنڈکٹر بھی خاموش تھے، وہ دونوں نوجوان بھی، دوسرے مسافر بھی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پہ کچھ سوچ رہا تھا۔

اتنے میں اندھیری کا بس سٹاپ آ گیا، وہ دُبلا پتلا آدمی، ایک ہاتھ پتلون میں ڈالے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بس کی آہنی سلاخ پکڑے ہوئے بس کے اندر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا گیا، میں

بھی اندھیری پر اُتر گیا، اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا، دراصل میراجی یہ چاہتا تھا، کہ میں اُس کمبخت کو اتنا تو جتا دوں کہ میں نے اس کی یہ بُری حرکت دیکھ لی ہے، میں اُسے اتنا جتانا چاہتا تھا۔ اور صرف ایک بار اُنگلی اٹھا کر اُسے چور کہنا چاہتا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے اندھیری اسٹیشن کی طرف مڑ گیا۔ نکڑ پر ایک چنے والا بیٹھا تھا، آخری فاصلہ اُس نے دوڑ کر طے کیا۔ اور چنے والے کے پاس پہنچ کر دو آنے اس کی طرف پھینک کر وہ چنوں پر اس طرح جھپٹ پڑا جیسے کوئی مدتوں کا وحشی بھوکا جانور شکار بھنبھوڑ بھنبھوڑ کر کھا رہا ہو۔ اُس کی نگاہوں میں قطعاً کسی قسم کی انسانیت نہ تھی، صرف بھوک ہی بھوک تھی۔ اور ایک خشمگیں چمک!

جب میں اُس کے قریب سے گزرا، تو بیشتر اس کے کہ میں اُس سے کچھ کہوں وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنسا۔ پھر اس نے اپنی لانبی پتلی اُنگلی میری طرف اٹھائی اور بڑی سختی سے کہا "چور!"

دو باہوں کا اندھیرا

آدھی رات کے وقت سندھیا گھبرا کر ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آئی اور کارلٹن کے خوبصورت لان کے ایک کونے میں بیٹھ گئی چاندنی بارش کی طرح برس رہی تھی! اور کیاریوں میں کھلے ہوئے گلاب گویا منہ کھلوئے ہوئے اس چاندنی کو پی رہے تھے لان سے پرے یوکلپٹس کے پیڑوں سے الائچیوں کی سی مہک آ رہی تھی اس چاندنی اور مہک نے رات کے سناٹے میں عجیب تشنگی اور درد سے معمور کر دیا تھا۔ رات کا جسم اس کے اپنے جسم کی طرح دکھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کسی کے لمس کا پیاسا، حالانکہ چاندنی برس رہی تھی۔ مگر یہ چاندنی گویا رات کی جلد اور اس کے جسم کی جلد کے اوپر سے برستی ہوئی گزر رہی تھی اور اندر تحلیل نہ ہو سکتی تھی۔ اندر جہاں فولاد لاوے کی طرح گرم تھا!

رات اور سندھیا دونوں دہک رہے تھے۔ ہوٹل کے کمروں میں کہیں کہیں روشنیاں نظر آتی تھیں۔ کوئی اس طرح جاگ رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد سب کھڑکیوں کی روشنیاں بجھ گئیں۔

صرف ایک کھڑکی کی روشنی باقی رہی۔ اس روشنی کے ہالے میں ایک عورت کا چہرہ نمودار ہوا، بال کھلے تھے۔ ہونٹ بھی کھلے آنکھیں بھی کھلی، شانے بھی کھلے۔ یہ عورت بھی رات کی طرح ہے انتظار کرتی ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ لیے ہوئے کچھ سوچ رہی ہے۔ کتنے دور اس کے خیال جاتے ہیں! بے تار کی برقی لہروں کے پاس پہنچ کر اسے واپس بلاتے ہیں۔ عورت بندرگاہ کیوں ہے؟ اپنی آغوش وا کئے دور دور تک سفر کرنے والے جہازوں کو اپنی گودی میں کیوں بلاتی ہے؟ کیا اس کی تقدیر میں ٹھہر کر انتظار کرنا ہی لکھا ہے یا یہی اس کی فطرت ہے خیالوں کے دھاگے اس قدر کمزور کیوں ہوتے ہیں۔ وہ پہنچنے والے تک پہنچ کہاں نہیں سکتے؟ بیچ ہی میں ٹوٹ جاتے ہیں کہیں پہ یا اگر پہونچ جاتے ہیں تو مچھلی کے کانٹے کی طرح کسی کے ذہن میں اٹک نہیں جاتے ہیں اور اسے اپنے پاس بلا کیوں نہیں سکتے۔ کب سے اپنے پاس بلا کیوں نہیں سکتے۔ کب سے وہ اس لان پر بیٹھی خیالوں کی لہریں دلیپ کے پاس بھیج رہی ہے۔ مگر دلیپ اس کے پاس اسی وقت کیوں نہیں آجاتا؟ دلوں کے اندر بے تار برقی کا ایک اسٹیشن ہونا چاہیئے کھٹ کھٹ کیا اور پیغام پہنچ گیا۔

رات پیاسی ہے رات پیاری ہے، رات پھولوں سے مہکتی ہے۔ رات چاندنی سے چمکتی ہے اور ہوا کے نیم گرم جھونکوں سے سانس لیتی ہے۔ اور ایک آہ بھرتی ہوئی قریب سے گزر جاتی ہے۔ کھڑکی میں اپنا چہرہ نکالے وہ عورت اسی طرح انتظار کر رہی ہے۔ یکایک پیچھے سے ایک مرد کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ اور وہ مرد اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ عورت چونک جاتی ہے۔ پھر سمجھ جاتی ہے۔ پھر اس کے چہرے پر کامل اطمینان اور سکون کا وہ تبسم آتا ہے، جیسے گودی میں جہاز آجائے۔ عورت پلٹتی ہے۔ اپنی خوبصورت ننگی باہیں کسی بیل کی لچکتی شاخوں کی طرح اپنے مرد کے گلے میں ڈال کر لٹک جاتی ہے اور کھڑکی بند ہو جاتی ہے۔

سندھیا اپنی باہوں میں منہ چھپا کر دھیرے دھیرے رونے لگی۔ رونے سے آرام ملتا ہے۔

جلتے ہوئے خون میں آنسو گرتے ہیں اور اس کی حدت کو بجھا دیتے ہیں۔ چاندنی پلاسٹک کی شفاف پرتوں کی طرح لان پر گر رہی تھی۔ چاندنی اگر بارش ہوتی اگر چاندنی سے جسم بھیگ سکتا۔ تو چاندنی سے بھی آرام ملتا۔ مگر چاندنی سے آرام نہیں ملتا۔ اسی لئے عورتیں چاندنی میں روتی ہیں اور انتظار کرتی ہیں۔ اس۔ اس کھڑکی کے پردے سرک گئے اور وہاں اندھیرا ہو گیا اور یکایک سندھیا کو محسوس ہوا کہ وہ چاندنی میں بیٹھی ہے اور اندھیرا چاہتی ہے۔ تھوڑا سا اندھیرا صرف دو باہنوں کا اندھیرا۔ رات کے سایوں میں لپٹے ہوئے بوسوں کا اندھیرا کسی کے ہاتھ کی طرح جسم کے انگ انگ پر سرکتا ہوا اندھیرا، اندھیرا جو انگڑائی کی طرح ٹوٹتا ہے اور پھر جڑ جاتا ہے۔ اسی شفاف چاندنی میں ایسے اندھیرے کی تلاش ہی سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان سندھیا کو سب سے پہلے دلیپ پر غصہ آیا۔ کہ وہ اس وقت یہاں کیوں موجود نہیں تھا بے شک دلیپ کو معلوم نہ ہوگا کہ وہ اس وقت لکھنؤ کے کارلٹن ہوٹل کے لان پر بیٹھی تھی اس کا انتظار کر رہی ہے، مگر اسے اس وقت یہاں موجود ہونا چاہیئے عقل یوں سوچے نہ سوچے مگر عورت کی جبلت کبھی کبھی یوں سوچ لیتی ہے اور سوچ کر اپنے محبوب سے خفا ہو جاتی ہے پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ سیٹھ دھن پت رائے اپنی بیٹی کو چکر دے کر لکھنؤ لے آیا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اس کا چچا بہت بیمار ہے اور اس نے چچا کی بیماری کا نام اس لئے لیا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ سندھیا اپنے چچا . . . . کو بہت چاہتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً دلیپ کو اطلاع دیئے بغیر اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ آگئی۔ مگر لکھنؤ آکر معلوم ہوا کہ اس کا چچا تو بھلا چنگا تھا۔ اور جھانسہ اس کے باپ نے اس لئے دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا دل دلیپ سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اور اس کی شادی بلرام سنگھ سے کرانا چاہتا تھا یعنی اپنی پسند سے۔

تو پھر عورتوں کو پڑھانے کا مطلب کیا ہے؟ انہیں آزادی دینے کا مطلب کیا ہے؟ انہیں یورپ بھیجنے کا مطلب کیا ہے؟ صرف اتنا ہے کہ ان کے جسم پر ایک چمکتا ہوا اجنبی پالش چڑھ جائے اور ان کی روح بدستور اپنے والدین کی غلام رہے؟ ان کی مرضی کے خلاف عطا کئے گئے شوہروں کی خدمت گذار رہے۔ روح انکار کرے، مگر جسم اقرار کرتا ہے۔ یہ ریشم میں لپٹی ہوئی زیوروں میں لدی ہوئی۔ باندیوں سے گھری ہوئی، موٹروں میں بند عورتیں کس طرح ان برقعہ پوش عورتوں سے بہتر ہیں۔ جنہیں آزادی کی ہوا نہیں لگی؟ نرم روئی کے گالوں میں ملفوف انگور کے دانوں کی طرح یہ سیم تن نازک عورتیں کس طرح ان برقعہ پوش عورتوں سے بہتر ہیں جنہیں آزادی کی ہوا نہیں لگی؟ نرم روئی کے گالوں میں ملفوف انگور کے دانوں کی طرح یہ سیم تن نازک عورتیں بال روم کے فرش پہ ڈولتی ہوئی کس قدر ناکارہ اور کمزور معلوم ہوتی ہے! اپنی تمام مہذب اداؤں انگریزی فقروں اون کے لوگوں اور کافی کے پیالوں کے باوجود کیسی کرم خوردہ نظر آتی ہیں؟ سندھیا کے باپ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر اپنی بیٹی سے التجا کی تھی کہ وہ بلرام سنگھ سے شادی کرلے، کیونکہ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا جو اس کے بعد مل کو سنبھال سکتا اور بلرام سنگھ اس کی مل کا مینجر تھا، بڑے خاندان کا تھا۔ اور ہر لحاظ سے اس لائق تھا کہ سندھیا اس سے شادی کرلے۔ باقی رہا دل تو دل کو کسی نہ کسی طرح قرار آ ہی جاتا ہے۔ دل تو کسی نہ کسی طور پر سنبھل ہی جاتا ہے۔ مگر مل کا سنبھلنا مشکل ہے اس لئے جب معاملہ دل اور مل کا ہو تو ترجیح ہمیشہ مل کو دینی چاہیئے۔

پھر کل رات ڈنر سے پہلے دودھیا روشنیوں میں ناچتے ہوئے بلرام سنگھ نے اس کی کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے شادی کی درخواست کی تھی اور سندھیا نے جل کر اس سے کہا تھا۔

”مگر میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔!“

”مجھ سے نفرت کرتی ہو اور اس دیوالیئے ٹھاکر کے بھتیجے دلیپ سے پیار کرتی ہو، جسے بات

کرنے کی تمیز نہیں ہے؟" بلرام سنگھ نے کہا۔

سندھیا بولی۔ وہ تم سے زیادہ تمیز دار ہے۔ مسٹر بلرام سنگھ! یاد رکھو۔ میرا دل میرا ہے۔ جس پر میرا دل آئے گا۔ وہی اس کا حقدار ہوگا۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔"

بلرام سنگھ بولا۔ مگر مجھے اپنی محبت جتانے کا تو حق ہے۔ اتنی بات کہنے کا حق ہے کہ جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ اس کا خاندان دیوالیہ ہو چکا ہے، اس کی فصل لٹ چکی ہے۔ اس کا فارم کب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا۔ اور اب جب کہ میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ اس کے خاندان والوں نے اپنی کھیتی باڑی اس سے الگ کر لی ہے۔ اب وہ اکیلا تنہا اور بے یار و مددگار ہے۔ ایک ناکام انسان! مس سندھیا۔ اب تم اس کی آرزوؤں کے ویرانے میں جا کر کیا کرو گی!

"محبت ویرانے کو بھی گلزار بنا دیتی ہے۔" سندھیا نے دانت پیس کر کہا تھا۔

"ہرے بھرے گلزار بھی بے عقلی سے تباہ ہو جاتے ہیں اپنے آپ کو تباہ مت کرو۔ جمی جمائی مل کے عیش و آرام پر لات مت مارو۔ اس خوبصورت فضا کو دیکھو۔ یہ جگمگاتی روشنیاں یہ سرخ و سپید چہرے! یہ سرسراتا ریشمی ماحول! یہی زندگی ہے! ان کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی۔ اس گھاس پھوس گندے جھونپڑے، غلیظ کھیتوں والی اجڈ اور گنوار دنیا میں۔ جہاں دلیپ رہتا ہے؟"

اور سندھیا غصے سے بپھر کر بولی تھی"ارے، تم اس دنیا کو گالی دے رہے ہو۔ جس کے دم سے تمہارے شہروں کا نظام قائم ہے مجھے ان جگمگاتی روشنیوں کا لالچ مت دو۔

میں آدھی دنیا دیکھ چکی ہوں۔ اب میں جانتی ہوں کہ ان خوبصورت روشنیوں کے اندر کیسی کیسی معصوم آرزوؤں کا اندھیرا ہے ان سرخ و سپید چہروں کے اندر کس کی محبت کا خون دوڑ رہا ہے؟ ان سرسراتی ریشمی ساڑھیوں میں چھپی ہوئی کس غریب کی عریانی ہے؟"

پھر ڈانس ـــ ختم ہو گیا تھا۔ اور بلرام سنگھ نے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا تھا اور دونوں ہاتھوں

نے تالی بجاتے ہوئے اس سے کہنے لگا: "ڈانس بہت عمدہ تھا۔ تمہاری تقریر بھی بہت اچھی تھی مگر اس بے رحم دنیا میں صرف آدرش واد سے کام نہیں چلتا حقیقت مل کی فولادی مشینوں کی طرح سخت ہوتی ہے۔ حقیقت کو سمجھو۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔ اور تمہیں حقیقت کو سمجھانے کا ایک موقعہ دیتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پھر کسی دوسرے بلرام سنگھ نے اس سے ڈانس کی درخواست کی تھی کیونکہ بینڈ پھر بجنے لگا تھا۔

تیسرے پہر کی چاندنی جب شبنم سے بھیگنے لگی، جب گلاب کی پتیوں سے اداس کشید کی گئی شراب کی طرح قطرہ قطرہ بہنے لگی جب کارلٹن کے لان کی گھاس پر ننھی ننھی بوندیاں یوں چمکنے لگیں جیسے آسمان پر ستارے نکل آتے ہوں تو یکایک ہوا کے تیز جھونکوں سے یوکلپٹس کے پتے شانوں پر کھڑکھڑانے لگے۔ سندھیا نے خشک ہوا کے جھونکوں کو اپنے شانوں پر محسوس کیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی، گویا چاندنی کے خواب سے جاگ گئی ہو۔ اس نے ایک بار ٹھٹھر کر اپنی گرم شال کو اپنے شانوں پر لے لیا۔ اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اور کرسی سے اُٹھ کر لان سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلنے لگی۔ بڑی سوچ میں ڈوبی ہوئی .... اب وہ کیا کرے .... کیا نہ کرے .....؟

پورچ میں کھڑے ہوئے دو چوکیداروں نے اسے سلام کیا۔ ان کے سلام کا جواب اپنے سر کی ایک خفیف جنبش سے دے کر وہ اوپر جانے والا زینہ چڑھنے لگی۔ زینہ چڑھتے چڑھتے سامنے کی دیوار سے لگے ہوئے قدِ آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی، تو چند ثانیوں تک ٹھٹھک کر اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ باہر کی چاندنی نے گویا اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ بال الجھے الجھے سے اور ان میں چھلے پڑے ہوئے اور گال گویا شبنم میں دھوئے ہوئے اور آنکھوں کی سوگوار کیفیت ایسی من موہنی اور پیاری کہ اگر اس وقت دلیپ اسے دیکھ لیتا تو بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیتا۔ چند لمحوں تک اپنے عکسِ جمال سے مسحور سندھیا وہیں رہی۔ پھر بڑی احتیاط سے اس نے اپنی کمر کے خم کے

قریب اپنی ساڑھی کو ٹھیک کیا اور اوپر چلی۔

اوپر کی منزل کے دونوں برآمدوں کی بتیاں ایک کے سوائے گل ہو چکی تھیں۔ اس کے باپ کا کمرہ دائیں طرف تھا اور اس کا اپنا بائیں ونگ میں اور بیچ میں سنگ مرمر کے پانچ ستونوں کے درمیان ایک چھوٹا سا خوبصورت لاونج تھا۔ لاونج خالی تھا۔ مگر ایک چھوٹی تپائی پر ایک خاکدان میں ایک سگریٹ جل رہا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف مڑتے مڑتے یکایک ایک لمحے کے لئے سندھیا رکی۔ اس وقت آدھی رات میں کون اس کی طرح جاگ رہا تھا۔ اور لاونج میں بیٹھ کر سگریٹ پی رہا تھا؟ —— یا تھی —— ؟ کیوں کہ لاونج کے لیڈیز ٹائیلیٹ کے دروازے پر کھٹکا سا ہوا اور سندھیا فوراً ستون کی آڑ میں ہو گئی۔

ٹائیلیٹ سے لولا میک گی بہت ہی مصفا اور روشن ہو کر نکلی لولا میک گی کو وہ جانتی نہیں تھی، مگر پہچانتی ضرور تھی —— لولا میک گی مل منیجر بلرام سنگھ کی دوست تھی اور بالعموم ہر ہفتے کے آخر میں لکھنؤ سے پالن گڑھ جاتی ہے۔ جہاں ان کی مل تھی۔ اور چھپ کر بلرام سنگھ کے بنگلے میں ٹھہرا کرتی تھی کئی بار سندھیا نے اسے بلرام سنگھ کے بنگلے کے باغ میں چاندنی راتوں میں بلرام سنگھ کے ساتھ یا اکیلے ٹہلتے دیکھا اب جب کہ خود اس کی شادی بلرام سنگھ سے ہونے جا رہی تھی اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنے باپ سے بلرام سنگھ اور لولا میک گی کے تعلقات کا ذکر کر کے اس تجویز کو رد کر دے گی۔

مگر لولا میک گی اس وقت اوپر کے لاونج میں کیا کر رہی تھی۔؟ جب کہ بلرام سنگھ کا کمرہ ہوٹل کی نچلی منزل پر تھا۔

لولا میک گی نے ٹائلٹ سے نکل کر اسے ایش ٹرے کی پیندے میں زور سے دبا کر بجھا دیا۔ پھر اس نے بٹوے میں لگے ہوئے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا اور اسے جب ہر طرح سے اطمینان ہو گیا

تو وہ مسکرا کر اٹھی۔ اور اپنا پرس جھلاتی ہوئی دائیں ونگ میں چلی گئی۔

چلتے چلتے وہ ایک کمرے کے سامنے جا کر رک گئی۔ سندھیا کا دل دھک سے رہ گیا یہ اس کے باپ کا کمرہ تھا۔

لولا نے دھیرے سے کمرہ کھٹکھٹایا۔ کمرے میں روشنی ہوئی۔ پھر کمرہ دھیرے سے کھلا۔ سندھیا ستون کی آڑ میں اور بھی سمٹ گئی اور اس کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ اس کا باپ لولا کو دیکھ کر اپنے کمرے سے ایک قدم باہر نکلا اس نے شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے بازو سے لولا کو تھام لیا اور اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر کمرہ بند ہو گیا۔ مگر اندر کی بتی دیر تک روشن رہی اور دیر تک سندھیا سنگِ مرمر کے ٹھنڈے ستون سے لگی سوچتی رہی کہ اب کہ اب وہ اپنی قسمت کی فریاد کس کے پاس لے جائے؟ لولامیک گی بلرام سنگھ اور سیٹھ دھرم سنگھ میں مشترک تھی اس سے پہلے ان کے درمیان شوگر مل مشترک تھی اور ان کے خیالات مشترک تھے اور اب یہ دونوں اونچے اور باعزت آدمی اس بندھن کو اور پکا کرنے کے لئے اسے بھی شکنجے میں جکڑ رہے تھے۔ یعنی تم مجھے اپنی محبوبہ دو میں تمہیں اپنی بیٹی دیتا ہوں!

کیا خوب نقد سودا ہے!۔ مگر اس سودے میں وہ خود کہاں ہے؟

ترازو کے اندر؟ اس کے رنڈوے باپ کو اپنی بیٹی کی محبت غصب کرنے کا حق کیا تھا؟۔ اس ترازو کے اندر وہ اپنی بیٹی کی زندگی کو کیوں جھونک رہا تھا؟

غم اور غصے سے پہلے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر وہ یہ سوچ کر مسکرانے لگی کہ لولامیک گی نے اس کے باپ کے کمرے کے اندر جا کر اسے اسی وقت بہت سے پرانے جذباتی بندھنوں سے آزاد کرا دیا تھا اور یہ پرانے جذباتی بندھن اب رہے کہاں ہیں؟ بجلی کے کوندے کی طرح لپک کر لولامیک گی نے اس کے ذہن کو صاف کر دیا تھا۔ آج کل باپ باپ نہیں، وہ ایک

گولک ہے جس میں ہاتھ ڈال کر بیٹی پیسے نکال لیتی ہے۔ بیٹی بیٹی نہیں ہے۔ ایک بزنس کا پرامیسری نوٹ ہے۔ دوست دوست نہیں ہے خوشنما وعدوں کی رسید ہے۔ کوئی قربانی قربانی نہیں ہے۔ حال کو گروی رکھ کر بہتر مستقبل کو حاصل کرنے کا اسٹامپ پیپر ہے اور زندگی کے سب سے اچھے اور خوبصورت اصول وہی ہیں جو کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاس کرائے جاسکیں۔ ایسے ماحول میں وہ اپنے باپ سے کیا کہہ سکتی ہے۔

اور اس سے کس طرح کے انصاف کی توقع کی جاسکتی ہے؟ اب جو کچھ کرنا ہوگا اسے خود کرنا ہوگا۔

اپنے کمرے کی طرف واپس جاتے جاتے سندھیا نے طے کر لیا کہ وہ اپنی شادی کے خلاف اپنے باپ سے کچھ نہیں کہے گی۔ اور اس کو کچھ بتائے بغیر صبح کی پہلی گاڑی سے لکھنؤ چھوڑ دے گی۔ اور دلیپ کے پاس چلی جائے گی۔

غُسلیات

بہت سے بچوں کا نفسی تجربہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نہانے کی رسم پتھر کے زمانے بلکہ اس سے بھی بہت پہلے زمانے کی یادگار ہے۔ جب کہ اس کرۂ ارض پر حرف پانی ہی پانی تھا۔ آہستہ آہستہ اس پانی میں مچھلیاں، مینڈک، گھڑیال اور مگرمچھ پیدا ہوئے اور تخلیق حیات کے مختلف منازل طے کرتے ہوئے مختلف النوع ارتقائی درجوں کے بعد انسان کی موجودہ صورت کو پہنچے۔ چنانچہ آج بھی بیسویں صدی کا بچہ جب ٹب میں پڑے پڑے چلا اٹھتا ہے تو یقیناً پانی کے ٹھنڈا ہونے کی شکایت نہیں کرتا۔ بلکہ اس آبی زمانے کی وحشی رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ جس کے نام سے ڈارون کا نام ہمیشہ کے لئے وابستہ ہے۔

اس زمانے میں بہت سی پرانی وحشیانہ رسمیں متروک ہو چکیں، مگر نہانے کے متعلق

ابھی کچھ عرصہ اور جہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، میرے بہت سے احباب جو اس قابلِ نفریں رسم کے خلاف جہاد کرتے کرتے تنگ آچکے ہیں اور کچھ بہت پرامید نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جب تک پنجاب میں پانچ دریا بہتے رہیں گے۔ انسان بدستور ان میں نہانے اور گھڑیال، مگرمچھ اور خوفناک بھنوروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ یہاں میں ان لوگوں کا تفصیل سے ذکر نہیں چاہتا جو غسلخانوں میں نہاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پنجاب میں جہاں متوسط طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ ہر دو ہزار افراد کے لئے صرف ایک غسلخانہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ اور بعض اضلاع میں تو تناسب کا فرق بہت بڑھ جاتا ہے چنانچہ محکمہ دیہات سدھار کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہوشیارپور میں ایک بھی غسل خانہ نہیں۔

لیکن میں اپنے احباب کے نکتۂ نگاہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں مستقبل کے متعلق اس قدر نااُمید نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا عقیدہ محض ایک نام نہاد رسمی رجائیت کے فلسفہ پر مبنی ہو۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں یاسیت اور تذبذب میں پڑے ہوئے دلوں نے آج تک کچھ نہیں کیا اور پھر میرے پاس تو پُرامید ہونے کے لئے بہت سی وجہیں ہیں۔ انہیں بہ تفصیل بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) اس سیاسی خلفشار کے زمانہ میں لوگوں کو غسل سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو پہلے تھی، نہانا ایک انفرادی فعل ہے، اور فسطائیت یا اشتراکیت ہر دو مقبول عمومی فلسفے انفرادیت کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۲) جوں جوں "تہذیب" بڑھتی جا رہی ہے، انسان کو پانی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے اور نہانا محض ایک نچلے درجوں کی پسماندہ جماعتوں کے لئے رہ گیا ہے ورنہ شائستہ و

مہذب لوگ تو صرف ڈرائی کلین ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کنویں پر نہاتے نہاتے ایک پوربئے کا دوسرے پوربئے سے کہنا "اے یار، تو نے تو لٹیا ہی ڈبو دی" ذرا خیال کیجئے کتنا یتیم، غریب، افلاس زدہ فقرہ ہے، خودداری بلند حوصلگی اور تہذیب سے قطعاً عاری، میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی مجھے یہ بتا دے کہ وہ دن کے کے بجے نہاتا ہے تو میں یہ وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ مکمل تہذیب یافتہ ہونے کے لئے ابھی اسے کتنے مدارج اور طے کرنے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر :-

صبح چار بجے کون نہاتا ہے ؟ — پوربیا، بنیا میونسپلٹی کی سڑکوں پر پانی چھڑکنے والا مہتر!

صبح چھ بجے — ڈاکیہ، دفتر کا بابو، پولیس کا سپاہی۔
آٹھ بجے — پروفیسر، کالج کا لڑکا۔
دس بجے — صاحب بہادر، لیڈر۔
بارہ — منسٹر، مجسٹریٹ، رئیس اعظم۔

اس کے علاوہ جوں جوں آپ یہ مدارج طے کرتے جائیں گے آپ یہ دیکھیں گے کہ نہانے میں وقت بتدریج کم صرف ہو رہا ہے، اگر آپ پہلے غسل کرتے وقت آدھ پون گھنٹہ صرف کرتے تھے۔ تو اب صرف دو منٹ پر آ جائیں گے۔ اگر پہلے سارے جسم کو پانی میں بار بار ڈبوتے تھے تو اب صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کو تر کر کے "نہانے" سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

اور میں تو اس مہذب زمانے کا انتظار کر رہا ہوں کہ جب لوگ صرف اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پانی سے تر کر لیا کریں گے۔ اور پھر فخریہ لہجے میں اپنے احباب سے ذکر کیا کریں گے کہ لو بھئی آج ہم "نہائے"۔ اور یقیناً جس طرح ایک روز ہندوستان کو سوراج حاصل ہوگا۔ اسی طرح

وہ دن بھی ضرور آنے والا ہے جب کہ نہانے کی رسم اس ہندوستان جنت نشان سے قطعاً مٹ جائے گی۔ صرف کہیں کہیں جس طرح آج کل بعض راسخ الاعتقاد ہندو، سنیچر وار کو تیل کی پیالی میں پیسہ ڈال کر اپنا منہ دیکھ لیتے ہیں۔ بعض پرانی وضع کے بزرگوار راہ چلتے چلتے "ہفتہ کے روز پانی کی پیالی میں چہرہ دیکھ لیا کریں گے اور مہایت غرور سے کہا کریں گے" آج ہم نے تو غسل کر لیا۔ کتنی مدت کے بعد آج پانی میں منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ خدا غارت کرے اس نئے زمانے کو، آج کل لوگ نہاتے بھی نہیں۔ جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہماری اماں ہفتہ میں ایک دن ہمارے سارے جسم کو پانی سے تر کر دیا کرتی تھیں اور پتہ نہیں یہ کہاں تک سچ ہے۔ مگر ہمارے دادا جان ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب لوگ ہر روز اپنے جسموں کو پانی میں بھگو لیا کرتے تھے (ایک جھری جھری لے کر) واہ واہ اس نہانے میں کیا مزہ ہو گا!

غسل کے نقصانات جتانے کی ضرورت نہیں وہ پرانا عقیدہ کہ غسل کرنے سے مسام کھلتے ہیں۔ بدن صاف رہتا ہے اور جی ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ کبھی کا اپنی موت آپ مر چکا، میں خود اپنی پچیس سالہ تجرباتی زندگی کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ رادی میں نہانے سے مسام کھلتے نہیں بلکہ جو کھلے ہوں وہ بھی اکثر بند ہو جاتے ہیں اور جی کے ہلکے پھلکے رہنے کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ اگر غلطی سے راوی کا دو گھونٹ پانی اندر چلا جائے تو ہیضہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے۔ غالباً دریا کے کنارے شمشان بھومی بنانے کی غرض و غایت یہی تھی۔

پھر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نہانے سے بدن چست ہوتا ہے اور رنگ نکھرتا ہے تو سائنٹیفک نکتہ نگاہ سے اسے بھی غلط سمجھنا چاہیئے۔ نہانے کے فی الفور بعد بدن چست نہیں ہوتا بلکہ سکڑتا ہے۔ باقی رہا رنگ کا نکھرنا۔ اگر نہانے سے رنگ نکھرتا تو جنوبی ہندوستان کے باشندے کب کے "گورے" بن چکے ہوتے۔ اور سمندر کی ہر ایک مچھلی کا رنگ سفید ہوتا۔ مگر اسکے متعلق ایک کہانی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

دریائے تاپتی کے کنارے سات بھائی رہتے تھے وہ بہت لمبے اور نحیف الجسم تھے۔ ان کے جسم اس قدر کمزور تھے کہ وہ اکثر ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے۔ مبادا ہوا کا کوئی تیز و تند جھونکا انہیں اڑا کر لے جائے۔ وہ ہر صبح اُٹھ کر اپنے پھونس کے جسموں کو دیکھتے اور قدرت کی کاری گری پر حیران ہوتے۔ جس نے ان کو ابھی تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی دن بھر کلائی پکڑے ہوئے نبض ٹٹولتا رہتا۔ کوئی اپنے پتلے، کاغذی جسم پر بار بار ہاتھ پھیرتا اور سوچتا یا الٰہی اس جسدِ خاکی میں سانس کہاں اٹکا ہوا ہے ؟

ان کی سات بیویاں تھیں، موٹی۔ بانجھ اور بدصورت بیویاں، وہ سب کی سب اس قدر کریہہ المنظر تھیں کہ ہر ایک بھائی یہ سوچ کر دل دل میں کڑھتا رہتا "ہو نہ ہو میرے اس بھائی کی عورت میری بیوی سے قدرے اچھی ہے، اگر وہ مجھے مل جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

سات بھائیوں کے گھر میں نہانے کی رسم قطعاً متروک ہو چکی تھی بھائی تو اس خیال سے نہیں نہاتے تھے کہ چونکہ پانی میں تحلیل کرنے کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں وہ نہاتے نہاتے پانی میں بالکل حل ہی نہ ہو جائیں۔ اور بیویوں کو اس خیال سے نہانے نہیں دیتے تھے۔ کہ دریائے تاپتی میں گھڑیال بہت رہتے ہیں جو یقیناً موٹے جسموں والی عورتوں کو بہت پسند کریں گے۔

ایک دن تیسرے بھائی کی بیوی کے دل میں شیطان نے یہ خیال اُبھارا کہ اُسے ضرور نہانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ بیوی دوپہر کے وقت جب سب گھڑیال دریا کے کنارے ریت پر پڑے سوتے تھے۔ دریا پر گئی اور نہا کر گھر لوٹ آئی۔ جب وہ نہا کر لوٹی تو اس نے اپنے سیاہ بال پیٹھ پر پھیلائے ہوئے تھے، اس کے چہرے پر ایک عجیب چمک تھی، اور اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔

جب بھائیوں نے اسے دیکھا تو بے تاب ہو گئے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے، یہ میری

بیوی ہے، نہیں یہ میری بیوی بنے گی، اسے میں لوں گا، اسے میں لوں گا۔ گالی گلوچ سے نوبت دھول دھپا تک پہنچی، طمانچوں کا لگنا تھا کہ سارے بھائی چند لمحوں میں جان بحق ہو گئے، اور بیویاں بیوائیں بن گئیں۔ اور جب گھڑیالوں کو یہ خبر لگی تو تاپتی کے کنارے سے رینگ رینگ کر آئے اور ساتوں بیواؤں کو زندہ نگل گئے۔

آج دریائے تاپتی کے کنارے صرف ایک پھولس کا بڑا سا جھونپڑا پڑا ہے جس میں آدھی رات کے وقت کبھی کبھی یہ ہولناک صدائیں بلند ہوتی ہیں "اسے میں نہ دوں گا، یہ میری ہے، یہ میری ہے۔!"

نتیجہ: نہانا اخلاقی جرم ہے۔

آخر میں آپ استفسار کریں گے، تو یہ سولہ آنہ درست کہ نہانا ایک قبیح رسم ہے۔ اسے ملیامیٹ کر دینا ہی بہتر ہو گا۔ اس کے خلاف پُرزور پروپیگنڈہ کیا جانا چاہیئے مگر صاحب یہ تو سب وقتی، رسمی، ہنگامی باتیں ہیں۔ آخر آپ کا "پروگرام" کیا ہے۔ بغیر پروگرام کے آج کل کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔

لگے ہاتھوں وہ بھی سن لیجیے۔

۱۔ جو امیر شخص نہائے اسے سماج سے باہر نکال دیا جائے۔

۲۔ دفعہ ۴۴ الف میں یہ الفاظ ابزاد کئے جائیں۔

"ہر گاہ کہ ہمارے نوٹس میں آیا ہے وغیرہ وغیرہ .... جو غریب بلوہ کرتا ہوا یا نہاتا ہوا پکڑا جائے گا اسے فی الفور گولی سے ہلاک کر دیا جائے گا۔

میں ابھی یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ گنگو میرے سامنے میز کا کنارہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "بابو جی، غسلخانے میں پانی دیر سے دھرا ہے، آپ جلدی نہا لیں، ورنہ پانی ٹھنڈا ہو جائے گا"

میں قلم چھوڑ میز کی دراز سے ایک تولیہ نکال کر یہ شعر گنگناتا ہوا غسلخانے کی طرف بھاگ گیا۔

نہاؤ گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

دُنیا کی سب سے بڑی کتاب

"کتاب.... ہاں کتاب..... وہ کتاب تو میں ضرور لکھوں گا۔" رفیق حسین نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ "اور وہی ایک کتاب میری زندگی کا حاصل ہوگی۔"

"مگر کب لکھوگے وہ کتاب" ظفر نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "بیس برس سے یہی سن رہا ہوں۔ اب شروع کر رہا ہوں۔ اب شروع کر رہا ہوں۔ کب آئے گی وہ نیک ساعت؟"

"بس اک ذرا فہمیدہ کی شادی کر لوں۔" رفیق نے ظفر کی طرف جھک کر بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"پھر لکھوں گا کتاب!"

کتاب کا ذکر کرتے ہی رفیق کے چہرے پر ایک عجیب روشنی پھیل گئی۔ آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک آگئی اور وہ اپنے تابناک ادبی مستقبل کے زرفشاں لمحوں میں کھو گیا۔

رفیق اور ظفر دونوں بچپن کے دوست تھے۔ میٹرک تک ایک ساتھ پڑھتے رہے۔ پھر رفیق

کالج میں چلا گیا۔ ظفر کے ماں باپ غریب تھے۔ اس لئے وہ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکا۔ یوں بھی اسے نصاب کی کتابوں سے بہت کم دلچسپی تھی

سکول کی کتابیں کھولتے ہی اسے جمائیاں آنے لگتیں تھیں۔ ہاں شعر و شاعری، ناول اور قصّے کہانیوں میں اس کا جی بہت لگتا ہے۔ جب رفیق حسین بی ایس سی میں داخل ہوا، اس وقت ظفر ایک مشہور ادیب بن چکا تھا۔ اس کے کلام کے دو مجموعے اور تین ناول چھپ چکے تھے۔ مؤقر ادبی جریدوں میں اس کا نام عزت اور احترام سے پیش کیا جانے لگا تھا۔ فاضل تنقید نگار ممتاز نوجوان ادیبوں میں اُسے نمایاں درجہ دیتے تھے۔ محتاط سے محتاط ناشر بھی اب اس کی کتابوں کی آدھی رائلٹی تک ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر رہے تھے۔ ادب کے سب سے بڑے نقاد جمال احمد جمال اس کی کتاب ”سرمایہ گل“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا، اگر ظفر نے شاعری کے پیراہن میں محض لطفِ سخن کی خاطر وارداتِ رنج و محن کو سمیٹتے ہوئے ذاتی لگن کے اعتکاف میں محاکاتی شاعری کے علائم ترک کر دیئے تو ایک دن وہ بہت بڑا ناول نگار ہو گا۔“

ظاہر ہے اس تبصرے کے بعد کسی کو اس کے بارے میں تذبذب کیوں ہو۔ ظفر نے خیر پور کی نگینہ بیکری میں جہاں وہ کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اپنا استیعفیٰ داخل کر دیا اور اپنی پوری زندگی ادب کے لئے وقف کر دینے کا مصمم ارادہ لے کر دہلی چلا آیا۔ کہ یہ شہر دلپذیر ہمیشہ سے باکمالوں کے خیالوں کا مرکز بنتا رہا ہے۔ خیر پور سے دلی ہجرت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں ظفر کا جگری دوست رفیق حسین بی ایس سی میں پڑھتا تھا۔

رفیق حسین اب بھی ادیب بننا چاہتا تھا۔ ظفر کی طرح اسے بھی ناولیں پڑھنے اور قصّے کہانیاں گھڑنے کا شوق تھا۔ میٹرک تک دونوں دوست اکثر ایک ہی موضوع پر خامہ فرسائی کیا کرتے اور اپنے استادوں سے داد پاتے بلکہ اکثر رفیق عظمتِ فن اور تجرباتی تہ داری میں ظفر سے بازی

لے جاتا تھا۔ مگر رفیق کے خیالات دوسرے تھے۔ رفیق کا کردار بھی مختلف تھا۔ وہ کسی حد تک دبّو اور شرمیلا تھا۔ بغاوت کا جذبہ اس کے دل میں بھی تھا۔ لیکن اپنے ماں باپ کے سامنے اس کے اظہار کی ہمت اپنے میں نہیں پاتا تھا۔ بس دل مسوس کے رہ جاتا تھا۔ ظفر بہت جلد کسی فیصلے پر پہنچ جاتا تھا۔ رفیق آسانی سے کوئی فیصلہ نہ کر پاتا تھا۔ اس طرح بھی ٹھیک ہے اور اس طرح بھی ویسے قباحت اس طرح بھی ہے اور اس طرح بھی زندگی دو دھاری تلوار ہے اور دو نیم شاخِ گُل بھی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ہمیشہ یونہی سوچ کے رہ جاتا تھا۔ ظفر اپنے دوست کی کمزور طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کی اُفتادِ طبع پر کڑھتا بھی تھا۔ وہ اکثر رفیق سے کہتا تھا "یوں اپنے گھر والوں سے دبے دبے رہے تو زندگی بھر کچھ نہ کر پاؤ گے۔ اپنے دل و دماغ کے باغیانہ اور روشن جذبوں کو اظہار کا موقع دو تمہارا طرزِ تحریر مجھ سے بہتر ہے سچ کہتا ہوں۔ اگر لکھنا شروع کر دو گے تو چند سالوں میں ادب کی دنیا میں نام پیدا کر لو گے۔ یوں گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر جانا کیا تمہیں اچھا لگتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے کام نہ لو گے تو تمہاری روح کو زنگ لگ جائے گا۔"

رفیق نے ڈرتے ڈرتے ظفر سے کہا تھا۔

"ایک ناول تو شروع کیا ہے۔۔۔"

"کہاں تک ہو گیا ہے؟"

"ابھی تو صرف تین باب ہوئے ہیں۔"

"سناؤ۔"

رفیق نے بہت لیت و لعل کرنے کے بعد انتہائی مجبوری کی حالت میں ظفر کو اپنے ناول کے ابتدائی تین باب پڑھ کر سنائے۔ ظفر سن کر اچھل پڑا۔ کیسا انوکھا انداز بیان ہے کردار "گوشت پوست کے زندہ اور متحرک انسان معلوم ہوتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں رفیق تم اپنے آپ

پر ظلم کرو گے۔ ادب پر اور دنیا پر۔ اگر تم نے جلد سے جلد اس ناول کو مکمل نہ کیا تو میں زندگی بھر تمہیں معاف نہ کروں گا!"

رفیق اپنے دوست کی تعریف پر جھینپ سا گیا۔ نگاہیں نیچی کر کے بولا" نہیں مکمل تو کر دوں گا لیکن بی ایس سی کا امتحان پاس کر لینے کے بعد۔۔۔ والد صاحب کہتے ہیں فرسٹ کلاس لینا ہے تمہیں۔۔۔"

" ارے جہنم میں ڈالو بی۔ ایس سی کو اور فرسٹ کلاس کو۔۔۔ کیوں اپنی شاندار صلاحیت کو برباد کرتے ہو۔ ابھی اسی دم بغاوت کر دو اپنے ماں باپ کی روایت پرستی کے خلاف اور میرے ساتھ آ جاؤ۔ ہم دونوں دوست مل کر اپنی ادبی زندگی کے لئے تگ و دو کریں گے۔"

رفیق فرطِ مسرت سے ظفر کے گلے لگ گیا۔ بولا" پہلے بی ایس سی کر لوں۔ بس صرف بی ایس سی کر لینے دو مجھے۔۔۔۔۔۔ پھر میں یہ کتاب۔۔۔۔"

ظفر نے میز پر زور سے ہاتھ مارا اور غصے کی حالت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بی ایس سی کر لینے کے بعد رفیق اپنے والد کے زور دینے پر مکینیکل انجینیرنگ کا ڈپلوما حاصل کرنے کے لئے انجینیرنگ کالج میں داخل ہو گیا۔ ظفر کے شدید احتجاج کرنے پر اس نے اپنے دوست کو بارک پور لج سے خط لکھا۔ جس میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ ایک بار انجینیر بن جانے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے اس اخلاقی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جائے گا جو اپنے والد کا خواب پورا کر دینے کے سلسلے میں ایک بیٹے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہے۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ انجینیر بن جانے اور ایک معقول مشاہرہ پانے کے بعد اسے وہ قلبی سکون اور اطمینان بھی حاصل ہو گا۔ جس کے سہارے وہ اپنی فرصت کے سارے اوقات ادب کے لئے وقف کر سکے گا۔ وہ نامکمل ناول ابھی تک میرے پاس ہے انجینیر بن جانے کے بعد میں

سب سے پہلے اسی کو مکمل کروں گا۔ یہ میرا تم سے آخری وعدہ ہے۔

ظفر یہ خط پاکر چپ ہو گیا۔ کوئی کسی کو زبردستی ادیب نہیں بنا سکتا۔ پھر اس کی اپنی ادبی زندگی تھی۔ اُسے خود ابھی بہت دور جانا تھا۔ وہ خاموش تو ضرور ہو گیا لیکن اپنی ادبی جدوجہد، کاوشیں اور کامیابی کے دوران اپنے دوست کو نہیں بھولا گاہے گاہے دونوں دوست ملتے رہتے ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے رہتے۔ دونوں مل کر ادبی زندگی کی منزلیں ایک ساتھ طے کرنے کے خواب دیکھتے۔ ظفر بیقرار تھا کب رفیق انجینئر بنے اور اپنا وعدہ پورا کرے۔

لیکن مکینیکل انجینئر کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد اچانک رفیق کے والد کو کینسر ہو گیا۔ ایک دم بھرے پُرے کھاتے پیتے گھر کے حالات نے پلٹا کھایا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر رفیق کو ایک بار پھر ادیب بننے کا خیال ترک کرنا پڑا۔ اسے جلد ہی ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ اب جو بھی روپیہ اسے ملتا وہ اسے اپنے باپ کے معالجے پر پھونک دیتا۔ پانچ سال وہ اپنے باپ کا علاج کرتا رہا۔ امریکہ تک ہو آیا لیکن کینسر تو ایک لاعلاج مرض ہے۔ پانچ سال کے بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا

پھر اپنی بیوہ ماں اور تین بھائیوں کی پرورش اور تعلیم کا بوجھ اس پر پڑ گیا۔ لیکن رفیق نے ہمت نہ ہاری جیسے تیسے کر کے اس نے یہ سات سال بھی گزار دیئے۔ اپنے بھائیوں کو معقول تعلیم دلوائی اور انہیں برسرِ روزگار کیا اور جب تینوں بھائی کمانے لگے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔

“اب اپنی زندگی کی حسرت پوری کر سکوں گا۔ میرے دوست!” اس نے ظفر کو خط لکھا۔ “چھ ماہ کے اندر اندر تمہیں میرے ناول کا مسودہ مکمل مل جائے گا۔ یہ میرا تم سے آخری وعدہ ہے!”

لیکن انہیں دنوں ملک تقسیم ہو گیا اور اس کی خالہ اپنی پانچ بچیوں اور دو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو لے کر اس کی ماں کے گھر میں آ کر رہنے لگی۔ کیونکہ اس کا خاوند شرافت علی فسادات

یں مارا گیا تھا اور اب اس کی غریب بیوہ اور اس کے سات بچوں کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا۔

رفیق حسین کے تینوں بھائیوں کو اپنی خالہ کی مدد کرنی چاہیئے تھی اور رفیق نے انہیں لکھا بھی تھا۔ لیکن ان تینوں کی شادی ہو چکی تھی وہ اپنی اپنی الجھنوں میں گرفتار تھے یا قربانی کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے یا ان کی بیویوں نے انہیں اجازت نہ دی۔ کچھ ہوا اپنی خالہ اور اس کے سات بچوں کا بوجھ رفیق کے سر آن پڑا اور جس طرح بھی ہوا اسے اس بوجھ کو اٹھا لینا پڑا۔

ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ خانم سے اُسے بے پناہ محبت تھی اور خانم بھی چھ سال سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس طرح اس کا نامکمل ناول اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جس دن رفیق نے اپنی بیوہ خالہ اور اس کے سات بچوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اس دن اس کے کندھوں پر کوئی ایسی جگہ نہیں رہ گئی تھی جہاں وہ خانم کو بٹھا سکے۔ غصے میں سسکتی خانم پاکستان چلی گئی اس دن رفیق بہت رویا تھا۔

پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کام پر چلا گیا اس دن کے بعد کسی نے اسے سر اٹھا کر چلتے ہوئے نہ دیکھا۔ اس کے کندھے جھکے جھکے رہتے۔ کسی نے اسے نگاہ اٹھا کر آسمان کیطرف دیکھتے ہوئے نہ پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کتراتا ہو وہ جھکا جھکا چلتا، مضبوط بھاری بوجھل قدموں سے دیر تک راتوں کو وہ نقشے اور خاکے دیکھتا رہتا۔ کیوں کہ حکومت نے انسے گنگا پر ایک بہت بڑا پل تعمیر کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔ وہ انتہائی قابل، ائق اور دیانتدار افسر تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب ملائمت، گھلاوٹ اور حلاوت اسکے کردار ں آتی جا رہی تھی جیسے کسی نامعلوم کیمیائی عمل سے اس کی زندگی کی ساری حسرتیں شہد بن گئی ہوں۔ اس سے نفرت کرنا بہت مشکل تھا اور اس کے قریب بیٹھ کر اس سے ہمدردی محسوس نہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

اس نے خانم کو لکھا مجھے تم یاد نہیں آتی ہو۔ تمہاری حویلی کا پرانا پھاٹک یاد آتا ہے اور ندی کنارے وہ جگہ جہاں ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر گیلی سنہری بالو کو اپنی انگلیوں سے کھود کھود کر اس میں سے میٹھے پانی کا چشمہ ڈھونڈا کرتے تھے مجھے حویلی کی مغربی جانب وہ دو چھوٹی چھوٹی برجیاں یاد آتی ہیں جن کے درمیان ایک طاقچہ تھا۔ کھڑکی میں کھڑی ہو کر تم میری راہ تکا کرتی تھیں۔ کیا معلوم تمہاری بے چین انگلیوں کو قرار آ گیا ہو۔ میں تو اپنی انگلیوں سے ابھی تک سنہری ریگ کھودتا ہوں۔ اور وہی پانی کا چشمہ تلاش کرتا ہوں۔"

جواب میں خانم نے اسے اپنے بچے کی تصویر بھیجی تھی۔

ترسائی ہوئی عورت بہت بے رحم ہوتی ہے۔

دیر تک گردن جھکائے وہ اس ننھے بچے کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ ریت ہی ریت... کتنی دور۔ کتنا گہرا۔ کہاں پر ہے وہ میٹھے پانی کا چشمہ ہے بھی کہ نہیں!

شاید لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

اس نے ظفر کو خط لکھا — "میں نے خانم کی یاد کو بھی وہیں رکھ دیا ہے۔ جہاں میں نے اس کتاب کو رکھا ہے۔ دونوں مجھ سے بہت دور ہوتی جا رہی ہیں شاید دنیا میں انسان کے اہم ترین کام وہی ہوتے ہیں جنہیں وہ کر نہیں سکتا!"

ظفر نے اس خط کا جواب نہ دیا۔ چند دنوں تک رفیق کے دماغ میں کھلبلی مچی رہی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا اس کے اندر زندگی کے چھوٹے چھوٹے غیر اہم کاموں میں اپنے آپ کو الجھا کر زندگی کی بڑی آرزوؤں سے کترا کر گزر جانے کی عادت پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی تو یہ پل بنانا ہے اس سے گنگا کا علاقہ کھلے گا کنور پور کے ضلعے کی تجارت بڑھے گی کسان اپنا اناج بہتر قیمت پر بیچ سکیں گے۔

پھر فہمیدہ کی شادی کرنی ہوگی۔ فہمیدہ رفیق کی خالہ کی سب سے بڑی لڑکی ہے۔

"پھر دوسرا پُل!" ظفر نے پوچھا اور رفیق نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر نفیسہ کی شادی؟" ظفر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

(نفیسہ خالہ کی دوسری لڑکی ہے) جب اس پر بھی رفیق نے اثبات میں سر ہلا دیا تو ظفر دیر تک خاموشی سے اس کا منہ تکتا رہا۔ پھر اک دم اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ رفیق نے سوچا — مگر یوں تو ہوگا ہی۔ نفیسہ کے بعد شمسہ کی شادی ہوگی۔ پھر کوئی ہسپتال، کوئی بلڈنگ، کوئی بند کسی سیکریٹریٹ کی کوئی عمارت نقشے خاکے ہزاروں مزدوروں، سینکڑوں ٹھیکیدار، درجنوں انجنیئر کوٹھیں، ڈیزل انجن، سیمنٹ کے بورے، خیموں میں جلتی ہوئی آگ۔ جھاڑیوں میں گزرنے والی ہوا سسکیاں لیتی ہوئی۔ پاؤں کیچڑ میں پھنس گیا ہے۔ رفیق دیر تک پاؤں کیچڑ سے نہیں نکالتا۔ وہ کیوں اپنا پاؤں کیچڑ سے نہیں نکالتا۔ وہ کیوں کتاب نہیں لکھتا؟ جس کے خالی اوراق روز رات کو اس کے سینے پر کھل کر کھڑکھڑاتے ہوئے پریشان کرتے ہیں دریچوں کے درمیان ایک پارچہ کھلتا ہے اور دیئے کے ہالے میں چاند نکلتا ہے لیکن اس کا پاؤں کیچڑ میں ہے۔

رفیق نے دھیرے سے ایک لمبی سانس لی اور پاؤں کو کیچڑ سے نکال لیا پھر وہ آہستہ آہستہ بھاری بھاری قدموں سے اور گیلے جوتوں سے نشان بناتا ہوا اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔

دو ماہ میں یہ بند مکمل ہو جائے گا اور اگلے سال خالہ کی تیسری لڑکی کی شادی بھی ہو جائے گی اور عرفان میٹرک پاس کر لے گا۔ لیکن خیمہ ابھی بہت دور ہے۔

یونہی چالیس برس گذر گئے۔ یونہی پچاس برس گزر گئے۔ یونہی گھسٹتے گھسٹتے وہ پچپن برس کا ہو گیا، اب اس نے سارے وعدے پورے کر لئے تھے اور سب کے قرضے چکا دیئے تھے۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ اس کی خالہ کی پانچوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی دونوں لڑکوں نے معقول

علیم حاصل کر لی تھی۔ اس کی خالہ کا گھر نیکیوں اور مرادوں سے بھر گیا تھا۔ اس کے تینوں بھائی خوشحال اور مطمئن تھے، مگن اور مسرور تھے۔ چلو یہ قرضہ بھی ادا ہو گیا۔ اور وعدہ بھی پورا ہو گیا جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ ایک انجینئر بننے کا۔ درجنوں پل، عمارتیں، بند، بلڈنگیں، بلاکس، سکول اور کالج ان سب کی تصویریں اس نے ایک البم میں سجا رکھی تھیں۔ دوسرے البم میں اس کے خاندان کے لوگوں کی تصویریں تھیں جب وہ پچپن برس کا ہوا تو اس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت ہو گیا بہت ہو گیا! اب میرے کندھے سیدھے ہیں۔ کسی کا بار نہیں ہے ان پر بس جی بہت ہو گیا ہے۔ اب میں کتاب لکھوں گا۔ اپنی کتاب......

لیکن وہ مشین کا ایک بے حد کارآمد پرزہ تھا۔ حکومت اس کے کام سے بے حد خوش تھی۔ وہ اسے ترقی دے کر، ملازمت میں توسیع دے کر اور بہتر سے بہتر عہدہ دے کر رکھنے کے لئے تیار تھی لیکن یکایک رفیق نے فیصلہ کر لیا۔ وہ فیصلہ جو زندگی بھر کبھی نہ کر سکا تھا اب وہ ملازمت نہ کرے گا۔ ہرگز نہ کرے گا! بس کتاب لکھے گا۔

اس لئے افسروں، دوستوں، رشتے داروں کے سمجھانے کے باوجود اس نے کسی کی نہ مانی۔

اس نے پنشن لے لی۔ شہر چھوڑ دیا اور کتاب لکھنے کے لئے خانم کے گاؤں چلا گیا۔

”میں نے یہاں پر ایک کاٹج بنا لیا ہے۔“ اس نے ظفر کو خط لکھا۔ ”جہاں سے خانم کے گھر کی برجیوں کو دیکھ ـــ سکتا ہوں۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پُرسکون دیہاتی فضا ہے۔ کاٹج کے قریب میرے بچپن کی ندی بہتی ہے۔ دور تک ہرے بھرے ٹیلے ہیں ٹیلوں سے پرے اونچے پہاڑ ہیں۔ اب میں یہاں بیٹھ کر اپنا ناول پورا کروں گا میں نے سب کام ختم کر لئے ہیں۔ کسی کا کوئی قرض مجھ پر نہیں رہا۔ بس اب میں ہوں اور میری کتاب ہے۔“

کوئی دو سال بعد پھر ظفر کے نام اس کا خط آیا تھا۔

"آیا تھا کتاب لکھنے کے لئے، اپنی ادبی زندگی شروع کرنے کے لئے، ادیب بننے کے لئے لیکن یہاں آکر عجیب پریشانی میں پڑ گیا۔ سارے گاؤں میں اور آس پاس کے پانچ سات گاؤں میں کوئی سکول نہیں ہے تم کسی ایسے گاؤں میں کیسے کتاب لکھ سکتے ہو جس میں ایک بھی سکول نہ ہو۔ یہ کتاب کی بے عزتی ہے۔ اس لئے میں نے اپنے کاٹج میں سکول کھول لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے مجھے اتنے بڑے کاٹج کی کیا ضرورت ہے میرے لئے تو ایک کمرہ کافی ہے۔ دو سال سے بچوں کو پڑھا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کوئی اچھا اور ایماندار مدرس مل جائے تو اس کے حوالے یہ سکول کر دوں اور پھر اطمینان سے اپنی کتاب ۔۔۔۔۔۔"

ظفر نے خط آگے نہیں پڑھا۔ غصے میں اٹھا کے پھینک دیا۔

ایک سال بعد پھر رفیق نے اسے خط لکھا۔

"تم نے اپنے خط میں مجھے جتنی گالیاں دی ہیں وہ سب درست ہیں لیکن میری بھی تو سنو۔ سکول کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے لڑکے بھی آنے لگے ہیں۔ دو مدرس بھی رکھ لئے ہیں۔ پھر بھی فرصت نہیں ملتی۔ گاؤں میں ایک ڈاکٹر دے دیا حکیم بھی نہیں ہے۔ میں نے جی لگا کے ہومیوپیتھی کا کورس پورا کر لیا ہے۔ اب دوا بھی دیتا ہوں۔ خدا نے ہاتھ میں شفا بھی دی ہے۔ دور دور سے لوگ دوا لینے آتے ہیں۔ میں کسی سے پیسہ نہیں لیتا معقول پنشن ملتی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں پیسہ کیا قبر میں لے جاؤں گا۔ عجب الجھن ہو رہی ہے۔ لیکن مدرس ہوں ڈاکٹر ہوں۔ کبھی کبھی ان پڑھ دیہاتیوں کے خط بھی لکھنا پڑتے ہیں۔ ان کے جھگڑے بھی چکانے پڑتے ہیں۔ بالکل بچوں کی طرح ہیں ہمارے دیہات کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے، کچھ نہیں جانتے دنیا کتنی بدل گئی ہے سائنس کتنی ترقی کر گئی ہے؟ کچھ معلوم نہیں ہے انہیں۔ سوچتا ہوں۔

بالغوں کے لئے بھی ایک کلاس شروع کر دوں۔ لیکن سنو وہ کتاب .....“

پُرزے پُرزے کر کے ظفر نے وہ خط ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ طے کر لیا۔ اب وہ کبھی رفیق کو خط نہ لکھے گا۔

لیکن رفیق کے خط برابر آتے رہے۔

”گاؤں میں سوکھا پڑ گیا ہے۔ گاؤں میں ہیضہ پھیلا ہے۔ گاؤں میں قحط پڑا ہے لوگ کال سے بدحال ہوتے جا رہے ہیں۔ پنچایت میں دھوکے باز لوگ آ رہے ہیں۔ زراعت کا ڈھرا وہی پرانے ڈھنگ کا ہے۔ اسے تو بدلنا ہی ہوگا۔ لیکن بتاتا نہیں ان غریب اَن پڑھ لوگوں کو۔ کوئی کچھ نہیں سمجھاتا۔ آج کل کھیتی باڑی پہ کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ اور میرا خیال یہ ....“

ظفر نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آتشدان میں پھینک دیا۔

ظفر نے کیانتی کا ایک لمبا گھونٹ لے کر مکان کی کھڑکیوں سے باہر کے منظر کو دیکھا۔ باہر پہاڑی ڈھلوانوں نے بادلوں کے سپید لبادے اوڑھ لئے تھے اور ڈل پیازا کی پرانی رومن جھیل پر برف کی کلیاں گر رہی تھیں اور دوسرے کمرے میں ظفر کی اطالوی محبوبہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ہندوستان سے آئے ہوئے اس مجہول خط نے چند لمحوں کے لئے رومن شام کا خوبصورت افسوں توڑ دیا تھا۔ ظفر نے شام کا کیف پھر سے حاصل کرنے کے لئے کیانتی کے لطیف، نفیس، نازک ذائقے کو لہر در لہر اپنی زبان پہ پھرایا۔ اب وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ روم کے ایک مشہور پبلشر نے جو موریویا کا بھی پبلشر ہے اس کے چھ نئے ناولوں کو اطالوی زبان میں شائع کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ دوسرے کمرے میں ...... اس نے پورا گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اور اب وہ رفیق کے ساتھ خانم کے گاؤں سے گزر رہا تھا۔ رفیق کے پیہم اصرار پر اسے اس گاؤں میں آنا ہی پڑا۔ رفیق کے خطوں سے معلوم ہوتا تھا جیسے اب وہ واقعی سچے دل سے اور گہری لگن سے اپنی کتاب کے لکھنے کے لئے بیتاب ہے اس کے خط میں شعلوں کی سی تڑپ اور بیقراری تھی۔ وہ بار بار اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ ظفر انکار نہ کر سکا۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔ اپنے بچپن کے دوست کی خاطر اپنی آرام دہ زندگی کے چند دن ایک دور افتادہ گاؤں میں صرف کر سکتا ہے۔ تقریباً بیس برس کے بعد وہ اب رفیق سے ملے گا۔

لیکن ظفر اس دور افتادہ گاؤں کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا، صاف ستھرا لپا پتا گاؤں دیہاتیوں کے کپڑے معمولی اور موٹے۔ لیکن پھٹے پرانے بالکل نہیں کم قیمت کے لیکن صاف ستھرے اور قاعدے کے۔

اور لوگوں کی آنکھوں میں وہ چمک، اطمینان اور بھروسہ جو فراغت اور محنت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ کھیتوں میں بھوری اور سنہری فصلیں گنجان اور لہلہاتی ہوئی۔ سکول کے بچے کتابیں کھولے ہوئے۔ گھروں میں عورتیں سہانے گیت گنگناتی کام کرتی ہوئی۔ وہ زندگی جو اس نے یورپ کے دیہات میں دیکھی تھی وہی زندگی وہ آج وطن کے ایک گاؤں میں دیکھ رہا تھا اور یہ سب کچھ رفیق کے دم سے ہوا تھا۔ ظفر دیکھ رہا تھا۔ رفیق کو لوگ اسی محبت، عزت اور اپنائیت سے دیکھتے ہیں جیسے وہ کوئی باہر سے آنے والا بڈھا پنشنر نہ ہو بلکہ ان کے اپنے ہی گاؤں کا کوئی شفیق بزرگ ہو یا شاید ان کا باپ ہی ہو۔

ظفر نے یہ بھی دیکھا کہ رفیق بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں رعشہ ہے اور سر بھی بار بار ہلتا ہے حالانکہ ظفر اور رفیق دونوں کی عمر برابر تھی لیکن دیکھنے میں رفیق ظفر سے بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رفیق نے اپنے بڑھاپے کے خلاف مطلق کوئی جدو

نہیں کی۔ اس نے بڑھاپے کو بہت خوش اسلوبی سے منظور کیا تھا۔ اس کے برعکس ظفر کا چہرہ ایک لڑتے ہوئے آدمی کا چہرہ تھا۔ ایسا چہرہ جو ہر پیدا ہونے والی جھری کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔ رفیق کی نگاہوں میں بہت میٹھا درد تھا۔ ماتھے پر عجیب سی معصومیت تھی۔ مسکراہٹ بھی عجیب سی اپنائیت تھی۔ جیسے اس تبسم کے لئے اس جہان میں کوئی اجنبی نہ ہو۔ ظفر کی پوری شخصیت میں ایک فاصلہ تھا اپنی انا میں سمٹا ہوا۔ ایک ہالہ تھا دولت کا، شہرت کا، چاروں طرف کھنچا ہوا۔ ایک مغرور کامیاب آدمی اپنی ذات میں سمٹا ہوا . . . ہر لحظہ ہراساں . . . . . کہیں ایسا نہ ہو زندگی کے کسی لمحے میں اسے مرتبے کے مطابق عزت نہ ملے۔ باہر کی دنیا کو دیکھتے ہوئے اتنی عظیم الشان کامیابی کے بعد بھی شکوک و شبہات اور عدم تحفظ کے موہوم وسوسے اس کے دل و دماغ پر بار بار اٹھ جاتے تھے وہ ہمیشہ چوکنا سا رہتا تھا، ہمیشہ محتاط ہر فقرے میں دشمنی کی بو سونگھنے والا . . . .

لیکن رفیق کے دل میں کسی طرح کی غیرت نہ تھی وہ اس سے اسی طرح ملا جس طرح آج سے بیس سال پہلے، آج سے تیس سال پہلے، آج سے پچاس سال پہلے ملا تھا۔ وہی بے ریا محبت اور رفاقت کا جذبہ . . . . . جیسے عمر اور فاصلہ۔ خیالات کا اختلاف دولت اور شہرت کا ہالہ اس کے لئے ہیچ ہو یا شاید وہ اس سے واقف نہ ہو اور اگر واقف بھی ہو تو اسے درخور اعتنا نہ سمجھتا ہو۔

"لیکن اتنے برس تم نے اس کام کو ٹالا کیوں؟" ظفر نے رات کے کھانے کے بعد رفیق سے پوچھا۔

رفیق کچھ محجوب سا ہو کر بولا "میں نے ٹالا نہیں خود سے ٹلتا رہا۔ لیکن اب میں لکھوں گا۔ آج رات ہی سے شروع کر دوں گا لیکن میں چاہتا تھا کہ جب میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی

خواہش پوری کرنے جا رہا ہوں تم میرے پاس رہو کم سے کم پہلے چند دن کے لئے .... "

"میں سات دن سے زیادہ نہ ٹھہر سکوں گا " ظفر نے اسے بتایا۔

"بہت ہیں میرے لئے یہ سات ہی دن بہت ہیں " رفیق نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ کتاب لکھنے کی آرزو نے اس کی آنکھوں میں قرب وصال کی سی چمک پیدا کر دی تھی۔

"گو میرے ہاتھوں میں ہلکا سا رعشہ ہے لیکن خیالات اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ میں آج رات ہی سے کتاب لکھنا شروع کر دوں گا۔

صبح جس وقت ظفر رفیق کے کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت بھی رفیق اپنے کمرے میں میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا۔ اس کی پشت ظفر کی طرف تھی۔ ظفر دروازے سے چلایا۔

"ارے رفیق کیا آج ہی کتاب ختم کر دو گے؟ ناشتہ نہ کرو گے۔ .... دس بج رہے ہیں۔ دکھاؤ تو کتنے ورق لکھ ڈالے ہیں تم نے ....؟" یہ کہتا کہتا وہ رفیق کی میز کے قریب چلا گیا۔ قریب جاتے جاتے وہ کچھ ٹھٹکا۔

پھر دھک سے رہ گیا۔

رفیق رات کو کرسی پر بیٹھے بیٹھے مر گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا سامنے کی کھڑکی کھلی تھی جس میں سے خانم کی حویلی کی دو برجیاں اور ان کے درمیان ایک خالی پارچہ نظر آتا تھا۔ رفیق کی بے جان، بے نور آنکھیں اسی پارچے پر جمی تھیں۔

ظفر نے جھک کر پیڈ کی طرف دیکھا۔

پیڈ کا ورق خالی تھا۔

ظفر چند ثانیوں کے لئے رفیق کی کرسی کی ہتھی کو پکڑے حیران اور ششدر کھڑا رہا۔ چند ثانیوں

کے لئے اس کے خیالات منجمد ہو گئے تھے۔ پھر اس کا ہاتھ بے اختیار رفیق کے کندھے پر گیا اور اس کے خیالات دھیرے دھیرے بہہ نکلے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ رفیق مر گیا ہے اپنی زندگی کا بہترین کام اور اپنی حیات اپنی ارفع ترین آرزو پوری کئے بغیر۔۔۔۔ رفیق مردہ ہے رفیق جو لکھتا تو مجھ سے بہتر لکھتا۔ لیکن آج رفیق کو کوئی نہیں جانتا۔ کل کے اخبار میں کوئی سرخی نہ ہو گی۔ کیونکہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو دبا کر راکھ کر دیا تھا اور راکھ کو کوئی نہیں پہچانتا وہ بڑا آدمی بن سکتا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے کاموں میں الجھا کر ختم کر دیا۔ رفیق کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ظفر کے دل میں اپنے دوست کے لئے شدید جھنجھلاہٹ اور کسی قدر نفرت کے جذبات ابھرنے لگے۔

پھر یکایک اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ ٹھیک ہے۔ وہ شیکسپیئر کالیداس۔ ارسطو۔ غالب نہ بن سکا۔ وہ اپنے عہد کا ظفر بھی نہ بن سکا تو کیا ہوا؟ کیا زندگی صرف ایک عمود پر گزارنے کا نام ہے کیا وہ زندگی جو دھرتی کے متوازی گزاری جاتی ہے زندگی نہیں ہوتی۔ کیا دھان کے کھیت کو محض اس لئے حقارت کی نظر سے دیکھا جائے کہ وہ مونٹ ایورسٹ نہیں ہے؟ پھر کون ایک چھوٹا سا پل بنائے گا کہ لوگ اس پر سے گزر سکیں اور کون ایک گاؤں میں بیٹھ کر کام کرے گا کہ کسی کے منہ میں دو دانے جا سکیں اور کون اپنی محبت کو قربان کرے گا کہ ایک بیوہ کی بچیوں کی شادی ہو سکے؟ آج کل کے عہد میں بڑی احمقانہ باتیں ہیں ایسی۔

لیکن کیا زندگی انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں، مجبور قربانیوں، معمولی کاموں حقیر مہربانیوں اور شکستہ دل محنتوں کا نام نہیں ہے جن کا کوئی صلہ نہیں ہے۔ کوئی شہرت، کوئی عظمت نہیں ہے لیکن جس کے بغیر زندگی کا یہ تسلسل کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر میں رفیق کو کس طرح کوسوں؟ کیا کتاب صرف وہی کتاب ہوتی ہے۔ جو حرفوں سے عبارت

ہوتی ہے، جسے لفظ کہتے ہیں اور استعارے سجاتے ہیں شاید کتاب لکھنے کا کوئی دوسرا طریقہ بھی ہے۔ شاید قطرہ قطرہ اپنی آرزوؤں کا خون کرتے ہوئے رفیق بھی ایک کتاب لکھ رہا تھا۔ شاید ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں ایک کتاب لکھتا ہے۔ شاید یہ کورے اوراق بھی ادب کا بہترین شاہکار ہیں.....

ظفر کی آنکھیں پرنم ہو چلی تھیں۔ دھیرے دھیرے رفیق کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے اس نے اپنے خیالات کے جذباتی دھارے کو روکا۔ ابھی تو اسے گاؤں والوں کو خبر کرنی ہوگی۔ جنازے کا انتظام کرنا ہوگا۔ قبر کا.....اور......

رفیق کو مرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اس کے رشتے دار اسے بھول چکے ہیں۔ اب تو گاؤں میں بھی کوئی اس کا نام نہیں لیتا۔ اس کی قبر بھی ڈھ چکی ہے صرف ظفر کا لگایا ہوا کتبہ آدھا زمین میں دھنسا اور آدھا ترچھا کھڑا ہوا کسی طرح باقی ہے جسے گردن ٹیڑھی کر کے پڑھنا پڑتا ہے اور جس پر یہ عجیب و غریب عبارت کندہ ہے۔

"یہاں دنیا کا سب سے بڑا ادیب دفن ہے!"

اُونچا حساب

شروع میں میرا مزاج رومانی تھا۔ اور طبیعت حساس تھی۔ مجھے پھدکتی ہوئی چڑیاں پسند تھیں۔ اور نیلا آسمان اور دھنک کے کھلتے ہوئے رنگ اور وہ عورتیں، ہنستے ہوئے جن کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں۔ اور ندی جو پتھروں سے ٹھوکر کھا کر چلتی ہے۔ مگر میرے والد نے میری ایک نہ چلنے دی۔ (اُن کا نام گوبند رام ہے) انہوں نے کہا "بیٹا ہری رام، یہ دنیا رنگ کے پہیوں پر نہیں چلتی ہے بلکہ حساب کے پہیوں پر چلتی ہے۔ اس لئے تمہیں شاعر نہیں انجینئر بننا ہوگا۔"

ہمیشہ سے مجھے حساب سے نفرت رہی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ، یہ دو اور دو چار کیوں ہوتے ہیں؟ پانچ کیوں نہیں ہوتے؟ تین کیوں نہیں ہوتے؟ ڈھائی کیوں نہیں ہوتے؟ ایک اور ایک ملا کر دو کیوں ہوتے ہیں؟ ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔ جیسے کبھی کبھی زندگی میں ہو جاتے ہیں مگر حساب میں نہیں ہوتے، کبھی نہیں ہوتے۔ آپ لاکھ کوشش کر کے دیکھ لیجئے! مگر مجھے چونکہ

انجینئر بننا تھا، اس لئے میں نے حساب سیکھنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اور ڈپلوما حاصل کرتے وقت فرسٹ کلاس فرسٹ بھی حاصل کیا۔ اس خبر سے سب سے زیادہ خوشی شاردا کو ہوئی، جس کے ساتھ بچپن سے میری منگنی ہو چکی تھی۔ اور جسے میں بھی بہت پسند کرتا تھا۔ ہم لوگ ساتھ کھیلتے تھے ساتھ پڑھتے تھے۔ ساتھ ساتھ سوچتے سوچتے ہم نے تقریباً طے کر لیا تھا کہ وہ گھر کیسا ہو گا جس میں ہم رہیں گے۔ بچوں کی کتنی تعداد ہو گی۔ اور وہ ناشتے میں مجھے کیا کھلایا کرے گی؟ ہم نے سب حساب کر لیا تھا۔

مگر جب انجینئرنگ کالج سے مجھے فرسٹ کلاس کا ڈپلوما ملا تو ایک دن میرے والد کو لالہ بیوپاری ملے جن کی فرم میں میرے والد اکاؤنٹنٹ تھے۔ اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس پر غور کر کے میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اب میری شادی شاردا سے نہیں بلکہ مدھومتی سے ہو گی جو لالہ بیوپاری لال کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور بڑی حسین تھی۔ اور اس وقت نینی تال میں تھی۔ مجھے اب مدھومتی کا دل جیتنے کے لئے نینی تال جانا ہو گا۔ اگر میں نے مدھومتی کا دل جیت لیا، یا کم سے کم اگر مدھومتی نے میری مخالفت نہ کی تو لالہ بیوپاری لال مجھے اپنا گھر داماد بنا لیں گے۔

"مگر میرا اُن کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھے گا۔" میں نے اعتراض کیا۔ (میں اعتراض نہ کرتا۔ مگر اس وقت میرے ذہن میں شاردا کا سانولا اور شرمیلا چہرہ بار بار آ رہا تھا۔ آنکھوں کے تیکھے کونے آنسوؤں سے بھیگ چلے تھے۔ میں کیا کہوں گا، اُس سے۔ اب تو ہم نے اپنے گھر کے لئے پردوں کے رنگ تک چُن لئے تھے)

اس لئے میں نے ذرا زور دے کر کہا "دیکھئے پتا جی! — لالہ بیوپاری لال کروڑ پتی ہیں۔ انہیں اُن کی شان اور مرتبے کے مطابق ایک کروڑ پتی دولہا مل ہی جائے گا۔ ان میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔"

"وہ ایسا داماد نہیں چاہتے ہیں جس کا اپنا خاندان کروڑپتی ہو۔ تجربے نے بتایا ہے کہ اکثر ایسے امیر خاندانوں کے بیٹے اپنے باپ کے بزنس میں اپنے سسر کا روپیہ پھنسوا دیتے ہیں اس سے بڑی گڑبڑ ہوتی ہے، تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ روپیہ الگ پھنس جاتا ہے۔ آدمی جذباتی دلدل میں اُلجھ جاتا ہے۔ لالہ بیوپاری لال ایسی کوئی اُلجھن نہیں چاہتے۔ اس لئے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ تم آج ہی نینی تال کے لئے روانہ ہو جاؤ اور مدھومتی کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔ تمہیں بہت زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ کیونکہ لالہ بیوپاری لال خود بھی کافی کوشش کر لیتے ہیں۔ اِدھر وہ آج کل کانسٹرکشن لائن میں جا رہے ہیں۔ اگر گھر داماد انجینئر ہوگا تو ٹھیکوں میں کتنی بچت ہوگی؟ ذرا خود سوچو کہ پھر تم کیا سے کیا ہو جاؤ گے؟ پھر میرے بڑھاپے پر غور کرو۔ ماں کے چہرے پر لٹکتی ہوئی جھرّیوں کو گنو۔ اس جہیز کا حساب کرو، جو تمہیں اپنی تین کنواری بہنوں کی شادی میں دینا پڑے گا۔ اس رقم کو آنے پائیوں میں گنو، جو تمہیں اپنے چار چھوٹے بھائیوں کی تعلیم میں صرف کرنا ہوگی۔ ٹھیک سے حساب کرو!"

میرا فیصلہ سن کر شاردا بہت روئی تھی۔ سسکتے سسکتے اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "رام جی، یہ کس طرح کا حساب ہے؟"

میں نے کہا "اسے ہائر میتھیمٹکس کہتے ہیں!"

شاردا کی سانولی، بھولی بھالی صورت مدھومتی کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھی۔ مدھومتی کا اجلا تیز روشن حُسن ہیرے کی طرح جگمگاتا تھا۔ اور اسی طرح سخت تھا۔ اس کے ہونٹ یاقوت تھے، تو آنکھیں نیلم۔ گال لعل تو دانت موتیوں کی لڑیاں۔ وہ جب ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ منہ کی چھلنی سے پکھراج کے شفاف دانے بکھر کر گر رہے ہیں۔ ایک دن جب وہ اسی طرح بلا وجہ زور سے ہنس رہی تھی تو میرا جی چاہا کہ اس کے منہ کے نیچے اپنا رومال کھول کر رکھ دوں۔ اور

پکھراج کے سارے دانے سمیٹ لوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ ممکن ہے وہ اعتراض کرے اور میرے حساب میں گڑبڑ ہو جائے۔!

میں مدھومتی کو کالج کے زمانے سے جانتا تھا، وہ بڑی کھلنڈری خودسر اور شریر لڑکی تھی۔ بے حد بدمزاج اور حاکمانہ طبیعت پائی تھی۔ اُس نے وہ کبھی کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ مگر ہر سال پاس ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ کالج اس کے پتا نے قائم کیا ہوا تھا۔ وہ بات بات میں پروفیسروں کا مذاق اُڑا دیتی تھی۔ ایک روز کیمسٹری کے پروفیسر نے اُس سے پوچھا (وہ بے چارا نیا نیا آیا تھا۔ اور مدھومتی کو جانتا نہیں تھا۔ ورنہ پوچھتا ہی کیوں؟) "فولاد کیسے بناتے ہیں؟"

مدھومتی بولی "لوہے سے بناتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، لوہے سے تو بناتے ہیں مگر کیسے بناتے ہیں؟"

"انجینئر لوگ بناتے ہیں۔"

"انجینئر لوگ بناتے ہیں، مگر کیسے بناتے ہیں؟"

"کارخانے میں بناتے ہیں۔" مدھومتی تنک کر بولی۔

"ارے کارخانے میں بناتے ہیں۔ مگر کیسے بناتے ہیں؟" پروفیسر نے ذرا گرم ہو کر "کیسے" پر بہت زور دے کر پوچھا۔

"اب یہ بہت نامناسب بات ہے پروفیسر صاحب!" مدھومتی بولی "کہ آپ کے ہر سوال کا جواب میں ہی دیتی جاؤں۔ کیمسٹری کے پروفیسر آپ ہیں، میں نہیں ہوں!"

مگر اُس وقت تو میں نے اُسے دُور دُور سے دیکھا تھا۔ جیسے لوگ دُوربین سے چاند کو دیکھتے ہیں۔ مگر اس ذفت میں مدھومنی کے ساتھ چل رہا تھا، ہاتھ میں ہاتھ لیے ہوئے۔ تاریک دیواروں کے درمیاں چھوٹی سی پہاڑی سڑک پر چاندنی اور سائے کی شطرنج بچھی ہوئی تھی۔ تاریک فضا

میں اُن دیکھے پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ وقت الجبرے کے کسی مشکل سوال کی طرح خاموش تھا۔ اور مدھومتی کی کمر میرے ہاتھ کے جھجکتے ہوئے لمس سے ہر لحظہ ایک نیا زاویہ بناتی تھی۔ یونین ہال آنے سے پہلے میں نے برسوں پرانی کرم خوردہ کتابوں کو کھولا، اور شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ، بائرن اور لانگ فیلو کے شعر جومیٹری کی شکلوں کی طرح یاد کیئے۔ محبت کی مثلث میں کون سے شعر.....

......کس وقت منطبق ہوتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ عشق کا سارا میزانیہ بگڑ جاتا ہے۔ میں نے آج رات کی تاریک لمبی سیر میں مدھومتی کے بدلتے ہوئے موڈ اور مزاج کو دیکھ کر ہر عنوان سے شعر پڑھے، بلکہ جمع کیئے۔ آدمی جب اعداد جمع کرتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے، وہ سب مل کر ایک نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔ اس لیئے جب اتنے سارے شعر جمع کیئے جائیں تو ان کا ایک اثر کیوں نہ ہوگا۔ اس سے کوئی نتیجہ کیسے برآمد نہ ہوگا؟

جانے یہ میرے شعروں کے جمع کرنے کا عمل تھا کہ لالہ بیوپاری لال کے خطوں کا، کہ رومانی فضا کے نازک خطوط کا، کہ اُن زاویوں کا جو میرا ہاتھ اُس کی کمر سے بنا رہا تھا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے، کہ آج مدھومتی کا غرور اور مزاج شہد میں گھل گیا تھا۔ وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں لیتی اور چلتے چلتے رک رک کر میرے کندھے پر سر رکھ دیتی۔ اور چلتے چلتے میں چونک جاتا۔ دیودار کے پھیلے ہوئے تاریک مبہم سایوں کے درمیان مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کہیں پر کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کہیں پر اس پھیلی ہوئی تاریکی کے اندر دو بھیگی بھیگی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور کسی کا سانولا شرمایا ہوا چہرہ مجھ سے کوئی شکایت کر رہا ہے۔

اور چلتے چلتے میں نے دو تین بار اپنے سر کو جھٹک دیا۔ مجھے اس عدد کا خیال نہ کرنا چاہیئے جسے میں تفریق کر چکا۔

اس طویل سیر کے دوران میں کہیں پر مدھومتی کو یہ معلوم ہوا ہوگا کہ وہ مجھے پسند کر سکتی ہے۔

پہلی بار اُس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جن سے ایک خوبصورت عورت اپنی انگلی میں پہنی ہوئی ہیرے کی ایک نئی انگوٹھی کو دیکھتی ہے۔ پہلی بار اُس نے میرے چہرے کو نئی نظروں سے دیکھا۔ اور اندازہ کیا کہ میں کتنے قیراط کا ہوں!

پھر اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ کل بھی اکیلی میرے ساتھ چائنا پیک پر جائے گی۔ کل مجھے بہت صبح اس کے بنگلے پر پہنچ جانا چاہیئے۔ وہ میرے لئے ایک گھوڑا اور اپنے لیئے ایک ڈانڈی منگا کر رکھے گی۔ احتیاطاً، ممکن ہے راستے میں تھک جانے پر کہیں ان کی ضرورت پڑ جائے۔ ورنہ ہم جائیں گے پیدل ہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ اور زور سے میرا ہاتھ دبایا۔

اس رات میں نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا۔ اس خط پر صرف تین حروف کندہ تھے Q.E.D

اگر اس دنیا میں صرف حساب ہی سب کچھ ہے تو میرا یقین ہے کہ میرا باپ میرا خط پاکر بہت خوش ہوگا۔

دوسرے دن وہ بہت پریشان حال اور بُرے موڈ میں مجھے ملی "میں آج تمہارے ساتھ چائنا پیک نہیں جا سکتی"

"کیوں؟"

"اور تم بھی نہیں جا سکتے" اُس نے مجھے حکم دیا۔

"کیوں؟ میں نے پھر پوچھا۔

معلوم ہوا مدھومتی کا السیشین کتا بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ صبح آیا اُسے سیر کرانے کے لئے لے گئی تھی کہ وہ ایک پہاڑی ڈھلان پر سے پھسلا۔ اور اُس کی پچھلی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور وہ بہت بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ مدھومتی اُسے بار بار پیار کرتی تھی۔ مگر کتا آخر کتا ہے، یعنی وفاداری کے علاوہ ایک جسم بھی رکھتا ہے۔ اور جب جسم میں شدید درد ہو تو کتے

ایسا سچی محبت کرنے والا جانور بھی محبت کرنے کی بجائے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

”تم اسے ڈانڈی میں بٹھا کر فوراً ہسپتال لے جاؤ۔ اور ڈاکٹر سے کہو فوراً اس کا علاج کرے!“

”نینی تال میں مویشیوں کا ہسپتال کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں۔!“ میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

” اسے جانوروں کے ہسپتال لے جانے کے لئے تمہیں کون کہتا ہے۔ اسے تلّی تال کے ہسپتال میں لے جاؤ۔ آدمیوں کے ہسپتال میں!“

”اگر ڈاکٹر نے اس کا علاج کرنے سے انکار کیا تو؟“

”کیسے کرے گا؟“ وہ گرج کر بولی ”یہ ہسپتال میرے باپ کا قائم کیا ہوا ہے۔ تم جاؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کئے دیتی ہوں۔“

جس ڈانڈی میں وہ میرے ساتھ چاینا پیک جانے والی تھی، اسی ڈانڈی میں میں نے کتّے کو سوار کیا، خود ایک گھوڑے پر بیٹھا ہسپتال کے باہر پہنچ کر مزدوروں نے ڈانڈی رکھ دی۔ اور میں انہیں انتظار کرنے کے لئے کہہ کر ہسپتال کے اندر داخل ہوا۔

ایک مثلث نما برآمدے کے اندر ایک لمبا کوریڈور تھا۔ اس کوریڈور میں جا بجا بنچ بچھے ہوئے تھے، جن پر پژمردہ اور ملول، بیمار اور ان کے ساتھ آنے والے رشتہ دار اور دوست بڑی بے چینی اور بے صبری سے ہسپتال کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے“ ایک اردلی نے مجھے بتایا۔

”کیا بڑے ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں؟“ میں نے ہسپتال کے در و دیوار پر ایک نیم مالکانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ پوچھتے وقت خودبخود میرے لہجے میں ایک تیزی سی آگئی تھی۔ آخر اس ہسپتال کو مدھومتی کے باپ یعنی میرے ہونے والے سسر نے قائم کیا تھا۔

اردلی میرے تحکمانہ لہجہ سے چونک گیا۔ پھر اُس نے اپنا پہلو فوراً بدل دیا۔ اور جھک کر کسی قدر انکسار کے لہجے میں بولا" بڑے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں ہیں۔"

"تو انہیں جا کر خبر کرو، مدھومتی میم صاحب کا کتا آیا ہے۔!"

اردلی جا کر کافی دیر تک نہیں لوٹا۔ میں کوریڈور میں ٹہل ٹہل کر مریضوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دو بڈھے ہولے ہولے کھانس رہے تھے۔ اور باری باری کھانس رہے تھے۔ جب ایک کھانسنا بند کرتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ ان دونوں میں کسی طرح کا سمجھوتہ معلوم ہوتا تھا۔ ایک بچہ انتہائی دُبلا پتلا کمزور اور پیلا اپنی ماں کی گود میں برابر روئے جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بچے کو جس دن سے یہ پیدا ہوا ہے۔ آج تک کبھی مناسب غذا نہیں ملی۔ اور بے چاری ماں اپنے بیٹے کی بھوک کا علاج کسی دوا سے کرنے کے لئے اُسے شفاخانے لے آئی تھی۔ ایک آدمی پورے بنچ پر لیٹا ہوا جانوروں کی طرح ڈکراتا تھا۔ اور تین آدمی اُسے سنبھالنے میں لگے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا، رات سے وہ درد گردہ میں مبتلا ہے۔ آگے جا کر ایک کونے میں کھاٹ پر ایک آدمی کا جسم پڑا تھا۔ اور جگہ جگہ اس کے جسم سے خون جاری تھا۔ اور بہت سا خون جسم سے بہہ کر کھاٹ کے نیچے ایک چھوٹی سی دلدل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا اس آدمی پر جنگل میں باگھ نے حملہ کیا تھا۔ کچے گوشت کے لوتھڑے سے اُس کی ٹانگوں سے اُدھڑ رہے تھے۔ اور اُس کا چہرہ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور تقریباً جان کنی کی سی حالت تھی۔ اس کی بیوی اور اُس کا باپ بڈھا گھبرا گھبرا کر کبھی ایک اردلی اور کبھی دوسرے اردلی کے پاس جا کر ہاتھ جوڑتے تھے۔ اور اُن سے ڈاکٹر کو جلدی خبر کر دینے کے لئے منت سماجت کرتے تھے۔

یکایک بڑا ڈاکٹر اپنے کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے دو اردلی مؤدب اور بطخ کی چال چلتے ہوئے۔ ایک اردلی نے میری طرف اشارہ کیا تو ڈاکٹر جلدی سے میری طرف لپکا۔!

"سمندر کہاں ہے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"سمندر تو بمبئی میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور پہاڑ پر جھیل ہوتی ہے۔ سمندر نہیں ہوتا۔" بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سمندر مدھومتی کے کتے کا نام تھا۔ اس مسئلے پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس لئے مجھے چند لمحوں تک شرمندہ رہنا پڑا۔ بعد میں ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سمندر باہر ڈانڈی میں پڑا ہے۔ وہ اتنا بھاری ہے کہ میں اُسے گود میں اُٹھا کر لا نہیں سکتا۔ اور ڈانڈی والے بھی انکاری ہیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں۔" ڈاکٹر نے تیز لہجے میں ایک اردلی کو حکم دیا۔ "اسٹریچر باہر لے کر جاؤ، اور مدھومتی میم صاحب کے کتے کو فوراً اندر لے کر آؤ۔"

دو اردلی اسٹریچر لے کر فوراً بھاگے۔

بڈھے باپ کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ اور خوف اور وحشت سے اُس کے اوپر اُٹھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے کو بچا لیجئے اسے باگھ نے کاٹ کھایا ہے۔"

"ابھی دیکھتا ہوں۔" ڈاکٹر نے بڈھے باپ کو بڑی نرمی سے تسلی دیتے ہوئے کہا اور چند قدم آگے چل کر کوریڈور کے باہر کی طرف جانے لگا۔ مگر پھر یہ دیکھ کر رک گیا کہ دو اردلی کتے کو اسٹریچر پر رکھے ہوئے بڑی احتیاط سے لا رہے تھے۔ بڑا ڈاکٹر جلدی سے اسٹریچر کے قریب جا پہنچا اور اُس سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔

"ہیلو سمندر پُوَر ڈاگی YOU HAVE BEEN HURT, WHAT A SHAME بٹ ڈونٹ وری WE WILL SET YOU RIGHT IN A MINUTE اور پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ HE IS A BRAVE DOG"

میں نے پوچھا "کیا یہ کتا ہماری زبان نہیں سمجھتا؟"

ڈاکٹر نے بڑی نخوت سے کہا "صرف انگریزی سمجھتا ہے۔" پھر اس نے میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں کسی نیچ نسل کا کتا ہوں، مگر دو ٹانگوں والا۔

جب کتے کا اسٹریچر اس زخمی نوجوان کی چارپائی کے قریب سے گزرا، جسے باگھ نے کاٹ کھایا تھا تو اُس نوجوان کی بیوی نے ڈاکٹر کے پاؤں پکڑ لئے اور رو رو کر بولی "جرا ایک پل اسے دیکھ لیو۔ ڈاکٹر صاحب بھگوان کے لئے!"

"ابھی آتا ہوں، ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر نے گھبرا کر اپنا پاؤں پیچھے کر لیا۔ اور اسٹریچر کے ساتھ ساتھ اپریشن روم میں داخل ہو گیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے قریب ہم لوگ آپریشن روم سے نکلے۔ سمندر کے سب زخموں پر ٹانکے لگا دیئے گئے تھے۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی جوڑ کر اسے پلاسٹر میں رکھ دیا گیا تھا۔

"اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

پھر اُس نے سمندر کی تھوتھنی پر ہاتھ پھیرا اور بڑے پیار سے بولا "Brave dog"

کتے نے بڑے کمزور سے انداز میں اپنی دُم ہلائی۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اردلی کتے کو بڑی احتیاط سے دوبارہ اسٹریچر پر رکھنے لگے۔

جب اسٹریچر دوبارہ کوریڈور سے گزر رہا تھا تو ڈاکٹر ہمیں جلدی سے الوداع کہہ کر اس زخمی نوجوان کی کھاٹ کی طرف گیا۔ میں بھی کتے کے اسٹریچر کے ساتھ نہ جا سکا۔ اور ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے جا کے اُس کی نبض دیکھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا۔۔۔" بڈھا باپ کراہتے کراہتے بولا "کسی طرح میرے بادل کی جان بچا لیجئے۔"

"مگر یہ تو مر چکا ہے۔" ڈاکٹر نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔

جب تک میں زندہ ہوں، میں اُس بڈھے کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتا تھا، کبھی ڈاکٹر کی طرف۔ اور ہولے ہولے انکار میں سر ہلائے جاتا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں سے آنسو اُبھر رہے تھے اور وہ شدید جدوجہد سے انہیں روک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کئی دن کی ڈاڑھی تھی۔ اور اتنی جھرّیاں تھیں جتنی کسی ہل چلائے ہوئے کھیت میں ہوتی ہیں۔ چند لمحوں میں اس کے چہرے کی جھرّیوں میں پسینے کی دھاریں پھوٹ پڑیں۔ اس کا سارا چہرہ طوفان میں ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ پہلے چند لمحوں میں جیسے اس کے ہونٹوں نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی، پھر یکایک اس کی آواز ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑی اور وہ چیخ کر بولا: "مگر ابھی تو یہ زندہ تھا ڈاکٹر صاحب! ابھی تو یہ زندہ تھا میرا بادل!"

ڈاکٹر چند لمحوں کے لئے چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر کچھ سمجھے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

واپسی پر میں سارے راستے چپ رہا۔ میں نے گھوڑا چھوڑ دیا تھا۔ اور ڈانڈی والوں کو بھی رخصت کر دیا تھا۔ کیونکہ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے ازراہ ہمدردی مدھومتی کے کتے کو اسٹریچر ہی پر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اور اپنے دو اردلی ساتھ کر دیئے تھے۔ وہ بڑے عمدہ اور زندہ دل اردلی تھے۔ اور طرح طرح کے گیتوں سے میرا دل بہلاتے رہے۔ مگر میں چپ رہا۔

مدھومتی بے حد خوش ہوئی۔ اُس نے اردلیوں کو بیس روپے انعام میں دیئے۔ اور جب اردلی چلے گئے۔ تو اس نے اپنا گال میرے گال سے لگا کر مجھے انعام دیا۔ پھر دوپہر تک اپنے کتے کی طرف متوجہ رہی اور میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ اور اندر ہی اندر میرا دل بیٹھتا رہا۔

وہ مجھے اُداس دیکھ کر بولی: "تم تو ایسے بسور رہے ہو جیسے تمہیں میرے سمندر کے بچ جانے کی رتی بھر خوشی نہ ہو!"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے" میں نے نرمی سے کہا۔

"پھر کیا بات ہے؟" وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔

میں نے اسے ہسپتال کا سارا قصّہ سنا دیا۔

سن کر وہ فوراً سر جھٹک کر بولی "باؤلے ہوئے ہو؟ یہ جانگلو اکثر تو باگھ کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ باگھ تو ان کو کھاتے ہی رہتے ہیں۔ اور کھاتے ہی رہیں گے۔ ایسے سینکڑوں کیس ہو چکے ہیں۔ اور ہزاروں لوگ ہسپتالوں میں مرتے رہتے ہیں۔ اور جانے اس لمحے جب تم ہم دونوں بات کر رہے ہیں۔ کتنے لاکھ لوگ اس دنیا میں ایک منٹ میں مر جاتے ہیں۔ اس طرح حساب کرنے لگو گے تو دنیا میں کوئی کام نہ کر سکو گے سری رام!"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر بنگلے کے برآمدے میں لے آئی۔ اور آنکھیں نچاتے ہوئے بولی "آؤ یہاں بیٹھتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں گرم گرم چائے کے گھونٹ پیتے ہیں اور تم سے کیٹس کے پیارے پیارے شعر سنتے ہیں۔ ہائے کیٹس کے شعر کتنے نرم اور ملائم ہوتے ہیں، بالکل میرے کتے کے بالوں کی طرح!"

دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی، مجھے رجھاتی، پرچاتی رہی۔ مگر میرا دل کسی طرح نہیں بہلا۔ اور میں انتہائی کوشش کے بعد بھی چپ، ٹھس، اور اُداس بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سی جامد و ساکت اُداسی تھی، جس نے میرے محسوسات کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نہ بول سکتا تھا۔ نہ ہنس سکتا تھا۔ نہ سوچ سکتا تھا۔

چائے آئی، اُس نے اپنے ہاتھ سے میرے لئے چائے بنائی۔ پھر بسکٹوں کی پلیٹ آگے بڑھا کے بولی "لو کھاؤ!"

میں نے خاموشی سے انکار کیا تو اس نے ایک بسکٹ اُٹھا کر زبردستی میرے منہ میں ڈال دیا۔

بولی "کھانا پڑے گا۔ کھاؤ!"

میں بسکٹ کھانے لگا۔ پھر ایک عجیب وغریب واقعہ ہوا۔ میں بسکٹ چبا رہا تھا۔ آپ ہی آپ میکانکی انداز میں میرے جبڑے چل رہے تھے اور میں بسکٹ کھا رہا تھا۔ اور اچانک مجھے محسوس ہوا کہ جو کچھ میں کھا رہا ہوں وہ نہ پھیکا ہے نہ میٹھا ہے، نہ نمکین۔ وہ بسکٹ بھی نہیں ہے، بلکہ کچے گوشت کا ایک پلپلا سا ٹکڑا ہے!

یکایک مجھے زور کی ابکائی آئی۔ اور میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ مدھومتی مجھے پکارتی ہی رہ گئی!

نہیں نہیں، آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں نے شاردا سے شادی نہیں کی۔ شادی تو میں نے مدھومتی ہی سے کی ہے۔ یہ لوانڈن کی بات ہے جب میں نوجوان اور ناتجربہ کار تھا۔ اور زندگی کے حساب میں پختہ نہیں تھا۔ اب تو میں ایک کامیاب آدمی ہوں۔ ایک بہت بڑی کانسٹرکشن کمپنی کا مالک ہوں۔ اب کہیں پر کتنے ہی لوگ مر جائیں۔ میرے بسکٹ کا ذائقہ کبھی نہیں بدلتا!

بڑا آدمی

رگو بھائی کے ارد گرد ہر چیز بڑی تھی۔ نہ صرف اس کا جسم بڑا تھا، اس کا دل بھی بڑا تھا۔ اس کی عقل بھی بڑی تھی۔ اس کا بنک بیلنس بھی بڑا تھا (بڑے بنک بیلنس کا بڑی عقل سے بڑا تعلق ہوتا ہے یہ سب بڑے لوگ جانتے ہیں) وہ بڑے بڑے ڈسٹری بیوٹروں سے بزنس کرتا تھا۔ بڑی بڑی پکچریں بناتا تھا۔ بڑے بڑے سٹار اپنی فلموں میں لیتا تھا اور رات کو وہسکی کے چھ بڑے پیگ پی کر سو جاتا تھا۔ رگھو بھائی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنے چھ فٹ کے لمبے موٹے بڑے جسم سے دیو زاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک جہاز کی طرح چلتا تھا۔ سمندر کی طرح ہنستا تھا اور مائیکروفون کی طرح بولتا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا۔

”منشی جی!“

"جی!" میں نے کہا۔

"مجھے ایک بڑی کہانی چاہیئے!" وہ بولا۔

"مدارس کی فلموں کی طرح لمبی؟" میں نے پوچھا۔

"لمبی نہیں۔ بڑی!"

میں نے کہا "بڑی کہانی تو بڑے موضوع سے بنتی ہے!"

"وضو کی بات کون کرتا ہے؟" وہ خفا ہو کر بولا "وضو تو نماز کے ٹائم پر ہوتا ہے۔ میں کہانی کی بات بولتا ہوں۔ تم وضو کی بات بولتا ہے۔ تم بھی اکدم ایڈیٹ ہے منشی جی۔!"

"کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟" میں نے سر جھکا کے اقرار کیا۔

"ارشاد اور شمشاد دونوں کو ہم نے نوی فلم کے لئے سائن کر لیا ہے۔ کل تک پریم بالا اور طائرہ بانو کا معاملہ بھی پٹ جائے گا۔"

"چار بڑی ہیروئنیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہم اپنی نئی پکچر میں چار بڑی ہیروئنیں لے رہا ہے، چار بڑے ہیرو۔ ٹاپ موسٹ ہیرو۔ عندلیب کمار، راج کافور۔ برجیندر کمار اور اکشے آنند!"

"تو چار بڑے ولین بھی لینا پڑیں گے آپ کو!" میں نے کہا "ہر ہیروئن کے لئے ایک ولین کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ بے چاری مصیبت میں نہیں پھنس سکتی۔ اور اگر ہیروئن مصیبت میں نہ پھنسے تو ہیرو فلم میں کام کیا کرے گا؟"

"منشی جی!" رگھو بھائی میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی سرکار!" میں نے کہا۔

"تم اکدم بدھو ہو!" وہ بولا۔

"آپ کی ذرہ نوازی ہے!" میں نے آداب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ذرہ نواز کو ولین نہیں لیں گے!" رگھو بھائی غصّے سے بولا: "اس پکچر میں ہم کسی کو ولین نہیں لیں گے۔ نہ ذرہ نواز کو نہ پردان کو نہ تیوری کو۔ اس پکچر میں ہر ہیرو دوسرے ہیرو کے لئے ولین کا کام کرے گا۔ عندلیب کمار، راج کافور کے لئے۔ راج کافور، برجیندر کمار کے لئے، برجیندر کمار اکشے انند کے لئے۔"

"کیا آئیڈیا ہے، کیا آئیڈیا ہے!" میں نے رگھو بھائی کے ہات چومتے ہوئے کہا: "ایک ہیرو دوسرے کا ولین! ایسا آئیڈیا آج تک کسی فلم میں نہیں آیا، کمال ہے، رگھو بھائی تم نے تو ہیروؤں کی کمر اور ہر رائٹر کا قلم توڑ دیا ہے!"

"منشی جی!" رگھو بھائی بولا۔

"جی مالک!"

"تم بہت اچھا آدمی ہے۔ اکدم فرسٹ کلاس منشی ہے۔ ہم تم کو سو روپیہ انعام دیتا ہے۔" رگھو بھائی نے خوش ہو کر جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے عطا کیا۔ "تم کیسا کیسا نیا آئیڈیا ہم کو دیتا ہے اسی لئے ہم تم کو کمپنی میں رکھے ہوئے ہے۔"

"آپ کی عنایت ہے!"

میں نے سر جھکا کر اور نوٹ کو تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، عنایت اب ہماری نہیں ہے۔ عنایت بائی کو ہم نے اپنی فلم کمپنی سے نکال دیا ہے سالی بہت لفڑا کرتی تھی۔"

"کیا لفڑا کرتی تھی؟"

"بہت وگڑا کرتی تھی!

"کیا رگڑا کرتی تھی ؟"

"بہت جھگڑا کرتی تھی !" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیا جھگڑا کرتی تھی ؟"

"بولی ہم تمہارے پکچر کے پریمیئر پر شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا۔ میں بولا، تم شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا تو اندر سے ننگا نظر آئے گا! وہ بولی۔ ہم اندر سے ایک ایسا پیٹی کوٹ پہنے گا جس میں ایک ایک ہزار کے نوٹ ٹکے ہوں گے، لوگوں کو اوپر سے شفان نظر آئے گا۔ اندر سے نوٹ! میں نے درزی کو بلا کر پوچھا تو وہ بولا:۔ ایسے پیٹی کوٹ پر پانچ لاکھ کے نوٹ لگے گا۔ میں نے کہا سالی ہم تم کو یہ پیٹی کوٹ کیوں دے گا۔ ہم: پنچ لاکھ کا بلڈنگ نہیں باندھے گا؟ ہاں ہم تم کو دس روپے کے نوٹ والا کوٹ جرور بنا کر دے سکتا ہے۔ اس پر بھی ہمارا تیس ہزار روپیہ لگ جائے گا۔ مگر چلو اپنی مرحومہ کے لئے ہم وہ بھی لگا دے گا۔"

"مرحومہ نہیں محبوبہ! میں نے کہا۔

"ہاں، ہاں مرحومہ ہو کہ محبوبہ ہو۔ ایک ہی بات ہے!" رگھو بھائی نے لاپرواہی سے کہا۔" ہم کوئی تمہاری طرح منشی نہیں ہے۔ کہ الفاظوں کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا پھرے۔ اس لئے ہم نے عنایت بالی کو فلم کمپنی سے باہر نکال دیا ہے۔ کیونکہ وہ پانچ لاکھ کا پیٹی کوٹ مانگتی ہے۔!"

"بالکل درست کیا آپ نے!"

"تو تم ہم کو بڑی کہانی کب لکھ دو گے منشی جی؟" رگھو بھائی نے کہا۔

"یہ کہانی بلیک اینڈ وہائٹ میں بنے گی یا کلر میں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی حساب سے کہانی سوچی جائے گی۔" میں نے رک رک کر کہا۔

"بڑی کہانی کبھی بلیک اینڈ وہائٹ میں نہیں بن سکتی! میں اس کو کلر میں بناؤں گا اور چار

کلر میں!" رگھو بھائی نے گرج کر کہا۔

"چار کلر؟" میں نے پوچھا۔ "یعنی لال، پیلا، نیلا اور سبز؟"

"احمق ہو!" رگھو بھائی غصّے سے بولا۔ "میں اس کو ٹیکنی کلر، گیوا کلر، ایسٹ مین کلر اور سوود کلر میں بناؤں گا۔ ہر تین ہزار فٹ کے بعد کلر بدلتا جاؤں گا۔"

"تو ایسی کہانی کوئی ایک رائٹر کیسے لکھ سکتا ہے؟ میں نے عاجزی سے کہا: "اس کے لئے رائٹر بھی چار سے کم نہیں ہو سکتے!"

"تم بولو" رگھو بھائی بولا۔ "میں تم کو انڈسٹری کے چار ٹاپ کے رائٹر لا کے دیتا ہوں، تم نام بولو۔"

"سکھ رام درما!"

"ڈن!" رگھو بھائی میز پر ہات مار کے بولا۔

"رگھر جانند گاگرا!"

"ڈن!"

"مہندر مہاراج آنند!"

"ڈن!"

"اور چوتھا۔؟۔ چوتھا؟۔" میں سوچنے لگا۔

رگھو بھائی بولا۔

"چوتھا، وہ خطرۂ ایمان کیسا رہے گا؟"

"خطرہ ایمان؟" میں نے گھبرا کر بولا۔ پھر لیکایک میری سمجھ میں آ گیا اور میں فوراً بول اٹھا۔ "اچھا اچھا۔ آپ کا مطلب...... اختر الایمان سے ہے؟"

"ابھی نام میں کیا پڑا ہے منشی جی۔" رگھو بھائی بیزار ہو کر بولا "تم کو دس دفعہ سمجھایا ہے، نام کے چکر میں مت پڑا کرو۔ مگر رائٹر وہ بہت بڑا ہے۔"

"ہاں رائٹر تو وہ بہت بڑا ہے!"

"تو اس کو لے لو، ڈن، ڈن، ڈن!! بس اب بولو۔ کہانی کب دیتے ہو؟ میں دس تاریخ کو مہورت کرنے والا ہوں۔" رگھو بھائی نے اعلان کیا۔

"آج چھ تاریخ ہے اور دس کو مہورت ہے، چار دن میں کہانی کیسے بنے گی؟"

"کیسے نہیں بنے گی؟" رگھو بھائی نے پوچھا "جب میں اپنی پکچر میں چار ہیرو، چار ہیروئنیں لے رہا ہوں اور چار کلر میں بنا رہا ہوں تو کہانی بھی چار دن میں بننی چاہیئے۔ کیسے بھی کرو۔ الٹا سلٹا کر کے مجھے چار دن میں کہانی بنا کے دو!"

"میں تم سب رائٹر لوگوں کو کھنڈالہ لے چلتا ہوں!"

"خوب!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور چار باورچی!" وہ بولا۔

"واہ، واہ!"

"اور چاروں ہیروئنوں کو بھی!"

"سبحان اللہ!" میں بولا۔

"اور چاروں ہیرو بھی چلیں گے!"

"ایں؟" میرے منہ سے مایوسی کی چیخ نکلی۔

"اور چار، چھ چھوکری لوگ کو بھی اُدھر اُدھر سے پکڑ لیتا ہوں!"

"وہ کس لیئے؟" میں نے پوچھا۔

د چھوکری لوگ آجو، باجو میں رہے تو کہانی کا مصالحہ گرما گرم مجے دار اور چٹپٹا تیار ہوتا ہے۔“ مجھے ایسا لگا جیسے میں کہانی نہیں گول گپے اور بھیل پوری کی چاٹ بنا رہا ہوں، مگر میں نے اپنی قسمت پر صبر کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیجئے تیاری کھنڈالے کی!“

رگھو بھائی بہت بڑا پروڈیوسر تھا اور بہت بڑا دل رکھتا تھا، اس لئے اس نے ان چار دنوں کا اہتمام بڑے شان دار طریقے سے کیا۔ اس نے چاروں ہیروؤں کے لئے ایک بہت بڑا بنگلہ کرائے پر لیا۔ پھر چاروں ہیروئنوں کے لئے الگ الگ ایک ایک بنگلہ لیا، خود اپنے لئے اور اپنی نئی محبوبہ رمبھا کے لئے الگ بنگلہ لیا اور رائٹر لوگ کے لئے کھنڈالے کے سب سے بڑے ہوٹل کی اینکسی کرائے پر لے لی۔ یہ ایک بنگلہ نما عمارت تھی اور پہاڑی کے اوپر ایک جنگل میں تھی، دوسری طرف اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ تیسری طرف ہوٹل کا نوکر خانہ تھا اور چوتھی طرف قبرستان تھا۔ غرضیکہ لکھنے پڑھنے والے لوگوں کے لئے یہ جگہ آئیڈیل تھی۔ رائٹر لوگ اسی اینکسی میں لاکر ڈال دیئے گئے اور ان کے پینے کے لئے رم کا بندوبست بھی کر دیا گیا جب کہ دوسرے پروڈیوسر صرف ٹھرا پلاتے ہیں۔ مگر رگھو بھائی کوئی معمولی پروڈیوسر نہ تھا، اس نے رائٹروں کے لئے رم کا، ایکٹر لوگوں کے لئے بلیک اینڈ وہائٹ وہسکی کا، اپنی محبوبہ کے لئے کوبن این کا اور اپنے لئے بلیک ڈاگ کا انتظام کیا تھا، کبھی کبھی محض شراب کی قسم سے اس کے پینے والے کی پوزیشن اور رُتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

پہلا دن سیر و تفریح میں گزرا، ملنے ملانے میں۔ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے میں۔ ایک دوسرے کے قریب آنے میں۔ رگھو بھائی رمبھا کو لے کر خرید و فروخت کرنے کے لئے لوناولہ چلا

گیا۔ ہیرو لوگ ہیروئنوں کو لے کر اطالوی مشن کی پہاڑی پر چلے گئے۔ رہ گئے رائٹر لوگ سو وہ آجو باجو کی چھوکریوں سے دل بہلانے لگے کیونکہ آدمی کی حیثیت صرف دولت ہی سے نہیں بلکہ شراب کی قسم اور عورت کے جسم سے بھی عیاں ہوتی ہے، ویسے سب انسان برابر ہیں۔

شام کے وقت بزنس سیشن شروع ہوا جس میں کہانی پر بحث ہونا تھی۔ اس سیشن میں چاروں ہیرو اور چاروں ہیروئن موجود تھیں اور رائٹر لوگ کو بھی بلا لیا گیا تھا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ فلمی کہانی میں رائٹر لوگ کا دخل بہت کم ہوتا ہے اور جو رائٹر فلمی کہانی میں زیادہ دخل دیتا ہے اسے کسی نہ کسی بہانے فلم کمپنی سے چلتا کر دیا جاتا ہے۔ رائٹر کا زیادہ سے زیادہ کام یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرے لوگ کہانی بنالیں وہ اس پر اپنا نام دے دے۔

جب سب کے جام مرتبے کے مطابق شراب سے بھر دیئے گئے تو کہانی پر بحث شروع ہوئی مگر چونکہ کہانی ایک سرے سے غائب تھی اس لئے اِدھر اُدھر کی کہانیوں پر بحث ہوتی رہی۔ ہالی وڈ کی دو درجن کہانیاں بحث میں آئیں۔ کچھ مدارس کی فلموں کا تذکرہ چلا کچھ پرانی کامیاب کہانیوں کو پھر سے بنانے کی تجویز پر غور کیا گیا، کچھ رائٹر لوگ ایسے موقعے پر بھی اپنے تلخ تجربے کے باوجود باز نہیں رکھے جا سکے۔ انہوں نے کچھ اپنی کہانیاں سنائیں جو فوراً انتہائی بیزاری سے اسی وقت رد کر دی گئیں

آخر میں رگھو بھائی نے ہات پر ہات مار کر اعلان کیا: ”آہا! ایک کہانی کا آئیڈیا آیا ہے!“

”کیا ہے؟ کیا ہے؟؟“ بہت سے لوگ اکدم بول اُٹھے۔

”سبحان اللہ! سبحان اللہ!“ میں نے کہا۔

”کہانی سنی نہیں اور ابھی سے سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے لگے؟“ ایک رائٹر نے میری کہنی میں ٹہوکا مار کر کہا۔

میں نے کہا: ”میں کہانی پر سبحان اللہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کہانی کا آئیڈیا

تو آگیا۔“

”کہانی کیا ہے؟“ دوسرے رائٹر نے پوچھا۔

”یقیناً اچھی ہوگی!“ تیسرا رائٹر بولا۔

”جلدی سے سنائیے تاکہ اسے لکھ لیا جائے۔ مہورت میں چار ہی دن رہ گئے ہیں!“ چوتھا رائٹر کاغذ پنسل تیار کرکے بولا۔

رمبھا نے مغرور نگاہوں سے سب پر نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی ”دیکھ لیا۔ کہانی سب لوگ سناتے رہے لیکن آئیڈیا آیا تو میرے رگھو بھائی کے بھیجے میں!“

رگھو بھائی نے کسی قدر شرما کر کہا ”کہانی کا آئیڈیا نہیں ہے ابھی پہلا سین سمجھ میں آیا ہے۔ آہاہا۔“

”سبحان اللہ! سبحان اللہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کس بات پر؟“ ایک ہیرو میری تصدیق سے خفا ہو کر بولا۔

”پہلے سین کے آنے پر!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا ”اور جناب والا جب پہلا سین سمجھ میں آ جائے تو سمجھو کہانی تیار ہے۔ کہانی میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ پہلا سین سمجھ میں آجائے۔ باقی کہانی تو خود بخود تیار ہو جاتی ہے۔“

رمبھا میری طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اسے میری بات بہت پسند آئی تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کے دیکھا۔ میں نے بھی مسکرا کے دیکھا۔ اس کی ساڑھی بہت خوب صورت تھی۔ چہرے کا میک اپ بڑا خوبصورت تھا اور زیور اس کے بڑے خوبصورت تھے اور جس عورت کے پاس یہ تینوں چیزیں خوب صورت ہوں وہ بڑی خوب صورت ہوتی ہے۔

”بے شک، بے شک!“ ایک ہیرو سر ہلا کر بولا ”فلم کی اوپننگ بڑی اہم ہوتی ہے اور اگر فلم کی اوپننگ دھانسو بن جائے تو سمجھو پوری کہانی بن گئی۔“

رگھو بھائی کھانس کر بولے "فلم یوں شروع ہوتی ہے کہ — ایک بہت بڑا ہال ہے۔ بہت بڑا ہال ہے۔ بہت بڑا ہال ہے اس کے ساٹھ دروازے ہیں اور تین سو ستون ہیں اور اس کے اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔"

"آٹھ سو؟" رائٹر لوگ کے آجو باجو کی لڑکیاں خوشی سے چلائیں کیونکہ اگر ڈانس کرنے کیلئے آٹھ سو لڑکیاں ہوں گی تو ان کو کام ملنا ضروری تھا!

"آٹھ سو لڑکیاں! — ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!" رگھو بھائی خوشی سے چلّایا" یہ میری فلم کی اوپننگ ہے! سمجھے آٹھ سو لڑکیاں، ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!"

"دو سو ٹیکنی کلر میں، دو سو گیوا کلر میں، دو سو سوودو کلر میں اور باقی دو سو ایسٹ مین کلر میں ناچ رہی ہیں۔" میں نے تجویز پیش کی!

"منشی جی!" رگھو بھائی خفا ہو کر چلّایا" تم اکدم گدھے ہو!"

"بجا فرمایا!" میں نے آہستہ سے کہا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے پنسل منہ میں لے کر چبانے لگا — !

"اوپننگ کا آئیڈیا فرسٹ کلاس ہے۔" دوسرا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔

"اوپننگ تو اچھا ہے مگر اس میں ہیرو کہاں ہے؟" پہلا ہیرو بولا۔

"ہیرو کو میں لے آتا ہوں!" رگھو بھائی جلدی سے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے بولا اور جلدی سے رمبھا نے اپنی کرسی کی اوٹ سے بلیک ڈاگ کی بوتل سے ایک پیگ گلاس میں سوڈے کے ساتھ ڈال کے رگھو بھائی کو پیش کیا۔ رگھو بھائی نے ایک گھونٹ بھرا۔

"اب میں ہیرو کو فلم میں لاتا ہوں!" رگھو بھائی نے دونوں ہات پھیلا کر فاتحانہ انداز میں

چاروں طرف دیکھ کے کہا: "اب میں ہیرو کو فلم کے اندر نکالتا ہوں۔" اس نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اپنی فلم کے اندر سے ہیرو کی بجائے کسی خرگوش کو نکالنے جا رہا ہو۔ "دیکھئے! ہال کے اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔" ہال کے باہر ہیرو گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتا ہے۔ ٹپا ٹپ! ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!!"

"چھپا چھپ! چھپا چھپ!! چھپا چھپ!!!" دوسرا رائٹر بولا۔

"گھپا گھپ! گھپا گھپ!! گھپا گھپ!!!" چوتھا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔

مگر اس کی کمزور آواز آئی کسی نے نہیں سنی۔ رگھو بھائی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چلا کر کہنے لگا۔

"ہیرو آتا ہے۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے، ٹپا ٹپ! ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!! اس کے ہاتھ میں چابک ہے سڑاک سے وہ چابک گھوڑے کے منہ پر مارتا ہے۔ اور فٹاک سے اس کی پیٹھ سے اترتا ہے اور دھاک سے سیدھا اندر دروازے سے ہال میں گھس جاتا ہے!"

"سبحان اللہ! سبحان اللہ!!" میں جلدی سے چلایا کہ کہیں کوئی دوسرا رائٹر پہل نہ کر جائے۔

رگھو بھائی نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا، بولا: "ایک بات ہے منشی جی! — کہانی تم خوب سمجھتے ہو!"

"آپ کی مہربانی ہے!" میں نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا: "اگر اجازت ہو تو ایک آئیڈیا میں بھی عرض کر دوں!"

"بولو، بولو!" رگھو بھائی خوش ہو کر بولے

"ہیرو کو گھوڑے سے مت اتاریئے، وہ سڑاک سے چابک بھی مارے اور فٹاک سے گھوڑے

کی پیٹھ پر اچھلے بھی مگر اُترنے کی بجائے سیدھا ہال میں آجائے۔ گھوڑے پر سوار اور اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کرتی ہوئی۔ انہیں دیکھ کر ہیرو بھی گھوڑے کو ناچنے کے لئے اشارہ کرتا ہے اور اشارہ پاتے ہی اس کا گھوڑا بھی ناچنے لگتا ہے۔ ذرا خیال کیجئے رگھو بھائی۔ آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں، اور ان کے بیچ میں ایک گھوڑا بھی ڈانس کر رہا ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے ہیرو ہاتھ نیچے بڑھا کر ایک لڑکی کو اوپر اٹھا لیتا ہے اور اس کے ساتھ گھوڑے کی کاٹھی پر کھڑا ہو کر ڈانس کرنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی رمبھا ہے!"

"ہرے!" رمبھا زور سے خوشی سے چلائی۔

"بالکل یہی میں سوچ رہا تھا" رگھو بھائی بولا۔

"کیا بات پیدا کی ہے تم نے منشی جی!" پہلا ہیرو زور سے بولا "تم نے میری انٹری توطے کر دی۔ کمال کر دیا ہے، جی چاہتا ہے تمہارا قلم چوم لوں۔"

"مگر دوسرا ہیرو کدھر سے آئے گا۔" دوسرا ہیرو ذرا اداس ہو کر بولا۔

"کدھر سے بھی آسکتا ہے!" میں نے کہا "ہال کے ساتھ دروازے ہیں وہ کدھر سے بھی آسکتا ہے۔"

"میں دروازے سے نہیں آؤں گا۔"

"پھر تم کدھر سے آؤ گے؟" رگھو بھائی نے دوسرے ہیرو سے پوچھا۔

"میں —؟ میں اب ایک آئیڈیا دیتا ہوں۔ ہال میں آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے بیچ میں گھوڑا ڈانس کر رہا ہے گھوڑے کی پیٹھ پر نمبر وَن ہیرو، نمبر وَن ہیروئن رمبھا ڈانس کر رہی ہے۔ اتنے میں زور کا ایک پٹاخہ پھٹتا ہے اور چٹاخ سے روشندان کا کانچ ٹوٹ جاتا ہے اور میں —— دوسرا ہیرو —— روشندان سے چھلانگ لگا کر ہال میں کود پڑتا ہوں اور چلا کر کہتا ہوں ... یاہُو!"

"گریٹ!" دوسرا رائٹر بولا۔

"یس سر! " چوتھا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے! " تیسرا رائٹر بولا۔

"کہانی کیا تیر کی طرح سیدھی جا رہی ہے! " رگھو بھائی نے فخر سے کہا۔

"کہانی کو اگر اچھی اوپننگ مل جائے " میں نے کہا " تو سمجھو بیڑا پار ہے! "

"مگر تیسرا ہیرو کیسے اندر آئے گا؟ " تیسرے ہیرو نے پریشان ہو کے پوچھا " آخر کہانی میں ہم بھی تو ہیں! "

"بے شک ہیں آپ! " دوسرا رائٹر بولا " میرے خیال میں آپ اگر پیدل چل کر آئیں تو کیسا رہے گا؟ "

"بالکل بنڈل! " تیسرا ہیرو خفا ہو کر بولا " پہلا ہیرو گھوڑے پر آئے۔ دوسرا روشندان سے چھلانگ لگا کے آئے اور میں پیدل چل کے آؤں۔ آپ گھاس کھا گئے ہیں کیا؟ "

تیسرا رائٹر جس کا گلاس اب تک خالی تھا۔ خالی گلاس کو میز پر زور سے مار کر بولا " ایک آئیڈیا میں بتاتا ہوں اور جواب نہیں ہے صاحب تیسرے ہیرو کی انٹری کا۔ واہ واہ! کیا شاندار انٹری دی ہے میں نے! "

"کیا ہے؟ " رگھو بھائی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"آہا ہا! " تیسرا رائٹر سر ہلا کر بولا " کبھی کبھی کیا آئیڈیا سوجھتا ہے مجھے بھی، واہ۔ واہ۔ کمال کر دیا ہے میں نے بھی۔ اوہو۔ ہو غضب کی انٹری ہے۔ سچ کہتا ہوں ایسی انٹری دی ہے میں نے کہ ساری فلم کو اکھاڑ کے پھینک دو مگر اس انٹری کو اکھاڑ کے نہیں پھینک سکتے! "

"کیا ہے؟ جلدی بولو بھائی! " رگھو بھائی بے حد بے چین ہو کر بولا۔

"سنئے۔ " تیسرے رائٹر نے چلا کر کہا۔ " پہلا ہیرو گھوڑے پر آتا ہے۔ دوسرا ہیرو روشندان

سے چھلانگ لگاتا ہے۔ مگر میرا ہیرو ان دونوں سے اونچا ہے وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر آتا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر فراٹے بھرتا ہوا اڑتا چلا جاتا ہے اور وہال کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ایک چکر، دو چکر، تین چکر، چار چکر، پانچ چکر، چھٹے چکر میں وہ ہیلی کاپٹر کو اڑاتا ہوا۔ دروازے سے سیدھا اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اور اندر جاتے ہی ہیلی کاپٹر کو پیانو کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے اور ناچتا ہے۔ چکا چکا بوم چک چکا چکا بوم۔۔۔۔۔!“

”بروبر! اکدم بروبر!!“ رگھو بھائی خوشی سے چلایا۔ ”یہ انٹری اکدم پاس ہے، ہیرو رائیٹر صاحب کا گلاس بھر دو!“

”مگر میں کدھر ہوں؟“ چوتھا ہیرو رنجیدہ سُر میں بولا۔ ”میں کدھر سے آتا ہوں اس سین میں؟“

”تمہارے لئے ایک خندق کھودنی پڑے گی۔“ میں نے چوتھے ہیرو سے کہا۔

”ہال کے نیچے سے؟“ چوتھے ہیرو نے خوش ہو کر پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔

”پھر؟“ چوتھے ہیرو نے پوچھا۔

”پھر ہال کا ایک کونا پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے چوتھا ہیرو نکلتا ہے، ہاتھ میں پستول لئے۔“ چوتھا رائیٹر بولا۔ ”اور وہ ہال میں آتے ہی دھائیں، دھائیں گولیاں چلانی شروع کرتا ہے۔ چھنم دھاڑ۔ دھوم دھڑکا۔ لڑکیاں تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ چوتھا ہیرو آگے بڑھ کر گھوڑے پر ناچتے ہوئے ہیرو کو زمین پر گرا دیتا ہے!“

”اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر ــــ اور رمبھا کو لے کر ہال سے باہر نکل جاتا ہے!“ میں نے دونوں ہات اوپر اٹھا کر کہا۔

سب نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور رمبھا مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

آدھی رات، چاند اور سناٹا ۔!

میرے ایک ہات میں جام تھا، دوسرے میں رمبھا کی کمر تھی اور ہم دونوں کے بیچ میں بلیک ڈاگ کی بوتل رکھی تھی۔

"ڈارلنگ" رمبھا میری طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی "تم کتنے بڑے حرامزادے ہو، کیسے مجھے پہلے ہی سین میں لے آئے کہ چاروں ہیروئنیں منہ دیکھتی رہ گئیں ۔!"

"تم بھی کچھ کم سور نہیں ہو پیاری! میں نے اس کی کمر کو کستے ہوئے کہا "کیسے تم پروڈیوسر کو شراب میں اندھا چھوڑ کر اس وقت میرے پاس آ گئیں اور بلیک ڈاگ کی پوری بوتل ساتھ لے آئیں ۔!"

ہم دونوں آدھی رات کے وقت پروڈیوسر کے بنگلے سے ذرا دور اطالوی مشن کی پہاڑی پر ایک ڈھلان کے نیچے گل مہر کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ رات پریمیئر کی رات کی طرح حسین تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا آبشار ۔۔ فلم کی خالی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ دور دور کہیں کسی گاڑی کی کوکو، چتر گیت کی کسی دھن کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے بلیک ڈاگ بھی چکھ لی ورنہ آج تک کبھی چکھی نہیں تھی۔" میں نے رمبھا سے کہا۔

"یہ دنیا کی سب سے اچھی وہسکی ہے جناب!" رمبھا غرور سے بولی۔

"تم بھی دنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔" میں نے رمبھا سے کہا۔

"مجھے بھول مت جانا۔" رمبھا بولی "ابھی تو کہانی کا پہلا سین ہی ہوا ہے۔!"

"دیکھتی جاؤ، آگے کے سینوں میں بھی یوں گھماؤں گا کہ چاروں ہیروئنیں ہات ملتی رہ جائیں گی!"

رمبھا میرے سینے سے لگ گئی اور اک آہ بھر کر بولی "مجھے تمہاری حرامزدگی پر پورا بھروسہ ہے!"

میں اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

رات خالی۔

خالی جیسے شراب کی بوتل۔

رات تھکی ہوئی۔

جیسے پیار کی باہنوں میں لپٹے ہوئے دو جسم۔

رات بے سدھ۔

جیسے تیسرے پہر کی اوس میں ڈوبے ہوئے جسم۔ شبنم دھیرے دھیرے پھوہار کی طرح برستی ہوئی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر ٹہنیوں سے گرتے ہوئے، بے آواز، بے سدھ سپنوں میں کھوے ہوئے . . . .

یکایک کسی نے مجھے زور سے جھنجھوڑ کر جگایا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔

میرے سر پر رگھو بھائی کھڑا تھا۔

رمبھا نے اک نگاہ اٹھا کے رگھو بھائی کی طرف دیکھا وہ اک لمحے کے لئے خوف سے چونکی۔ پھر سر جھکا کر سسکنے لگی۔ ایک مجرم کی طرح۔

رگھو بھائی نے گھور کر رمبھا کی طرف دیکھا۔ میرے قریب سے اٹھا کر خالی بوتل کو دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر غصے سے چلایا۔

"تم — ؟ تم — ؟ میرے منشی ہو کر یہ گستاخی ؟" رگھو بھائی کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ "میں تم کو ایسا کمینہ اور چور نہیں سمجھتا تھا۔"

"معاف کر دو رگھو بھائی !" میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہات اس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔ "مجھ سے بڑی گستاخی ہو گئی ! میں نشے میں اپنا مقام تک بھول گیا اور تمہاری لڑکی کو چرا لایا۔ یہاں !"

"لڑکی — ؟ لڑکی کی کون بات کرتا ہے ؟" رگھو بھائی نے چلا کر کہا۔ "سالی لڑکیاں تو ممبئی میں گیارہ

مل جاتی ہیں۔ مگر بلیک ڈاگ نہیں ملتی۔ سارے شہر کو چھان کر میں دو بلیک ڈاگ لایا تھا۔ ایک میں نے آج پی لی۔ دوسری تم نے آج رات چُرا لی۔"

"ہائے! رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اٹھائی اور گلوگیر لہجے میں بولا "اب میں کل بلیک ڈاگ کہاں سے پیوں گا؟ اور پرسوں کیا پیوں گا؟"

رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اپنے سینے سے لگالی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!

نئی قمیض

یاد نہیں کس نے پہلے پہل ملوایا تھا۔ دھواں دھواں سی آنکھیں، میلی بھوری جلد، جسم میں میرے سر سے پاؤں تک کہیں جھکاؤ نہیں۔ ٹانگیں پھیلا کے اور بالکل اکڑ کے چلنے کا انداز۔ کپڑے اتنے میلے اور کثیف کہ اب اُن کے رنگ، روپ، ساخت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ پتلون پہنے ہے یا پائجامہ۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا۔ جو وہ پہنے ہوئے ہے۔ وہ اب اس کے جسم ہی کا ایک حصہ ہے۔

پہلی نگاہ میں معلوم ہو گیا کہ آدمی میرے ڈھنگ کا ہے۔ اس کے میلے گندے ہونٹوں کا تبسم بے حد ذہین اور طنز آمیز تھا۔!

“ان سے ملو۔ یہ عرش ہیں۔ فلمی مکالمے بہت عمدہ لکھتے ہیں۔” ملوانے والے نے

مجھ سے کہا۔

اپنے تعارف کے جواب میں اس نے بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ میری طرف سرکا دیا۔ میں نے اُسے ذرا سا جھُلا کے واپس کر دیا۔ مگر اسے غالباً اپنے ہاتھ کے واپس آجانے کا احساس نہ تھا۔ وہ ہاتھ میرے اور اس کے درمیان کئی لمحوں تک خلا میں ایک عجیب بے یقینی کے عالم میں جھولتا رہا۔!

عرش میری طرف دیکھ کر تھوڑا سا ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی گاڑھی تھی۔ گہری صعوبتوں کا ملغوبہ، بڑی بدذائقہ ہنسی تھی۔ مگر آپ کچھ کر نہیں سکتے ایسی ہنسی کا۔ کیونکہ اس دنیا میں دوسرے لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں تو آپ کو ان کی ہنسی چکھنا پڑتی ہے۔ یہی حال غالباً دوسرے لوگوں کا ہوتا ہوگا۔ آپ کے سلسلے میں ایک زنجیر ہے عرش سے فرش تک.....

"انہیں کچھ کام دیجیے۔" ملوانے والے نے مجھ سے کہا — (اس وقت حافظہ ملوانے والے کی تصویر سے بالکل خالی ہے۔ کوئی صورت نہیں اُبھرتی۔ بس اتنا یاد ہے کہ ان دنوں میرے پاس فلمی کام بہت تھا۔ بالعموم نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ہو گیا۔ اس لئے میں ایک مددگار کی تلاش میں تھا۔) میں نے عرش کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر ان آنکھوں کی پتلیوں پر کُہرا چھایا ہوا تھا۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اس کی پتلیوں کا رنگ کبھی معلوم نہ کر سکا۔

پھر اس دھندے سے نکل کر ایک جھجکتی شرمیلی مہذب سی نگاہ مجھ تک پہنچی۔ جیسے میرے دل کو ٹٹول رہی ہو۔ بہت آہستہ سے دستک دے رہی ہو —!

میں نے عرش سے کہا۔ آپ کہاں کے ہیں عرش صاحب؟"

"اکبرآباد کا مغل ہوں۔" اُس نے کرڑی آواز میں کہا۔

پھر وہی گاڑی ہنسی..... بیزارکن..... جلدی سے وہ سر جھکا کے بیڑی پینے لگا۔

جیسے۔ بیڑی کے دھوئیں میں وہ اس ہنسی کو چھپائے گا۔!

میں نے مکالمے لکھوا کے دیکھے۔ واقعی عمدہ تھے۔ زبان شستہ و رفتہ۔ منجھا ہوا مشاق قلم، سین کو سمجھتا ہوا۔ ڈرامے کے اسلوب سے واقف، کیمرے کی ضروریات سے آگاہ، کرداروں کی افتادِ طبع سے آشنا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

"عرش صاحب آپ دوسروں کے لئے، اِدھر اُدھر کے چند متفرق سین کیوں لکھتے ہیں جن پر آپ کا نام بھی نہیں دیا جاتا۔ آپ خود سے کوئی فلم کیوں نہیں لکھتے؟"

"صاحب چھ فلمیں لکھی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"پھر؟"

"دو نے سلور جوبلی بھی منائی۔" وہ پھر چپ ہو گیا۔

"پھر؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کچھ نہیں۔" اس نے آہستہ سے اپنے سر کے سیاہ و سفید بالوں میں اپنی نیم مردہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"اگلا سین دیجئے!"

میں نے اگلا سین دیا۔ اُس نے دو گھنٹے میں لکھا مجھے پسند نہیں آیا۔ پھر سے لکھنے کو کہا۔ تین گھنٹے کے بعد اُسی سین کا نیا خاکہ سنایا۔ جو پہلے سے بھی بُرا تھا۔!

"دراصل بات یہ ہے۔" وہ سر جھکا کے بولا۔ "میں پہلی چوٹ والا رائٹر ہوں۔ پہلا وار اگر اوچھا پڑا تو دوسرا اس سے بھی اوچھا پڑتا ہے۔!"

دھند، غبار اور کہرے میں لپٹی ہوئی اس کی پتلیوں کے اندر سے پھر وہی ایک شرمیلی جھجکتی سی نگاہ مجھ تک آئی۔!

مجھے بُرا نہیں لگا وہ آدمی۔ میرے لکھنے کا انداز بھی وہی ہے۔ میں نے اسے بتایا۔ ذہن پہلی مرتبہ جو راستہ بنا لیتا ہے پھر اُسی جادے پر رواں ہو جاتا ہے۔ برق رفتاری سے منزل تک پہنچتا ہے۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے، کاٹ چھانٹ کرنے، دوبارہ آگے پیچھے دیکھنے سے جی بہت گھبراتا ہے۔ ہاں صرف اوّل ہی حرف آخر ہے۔ شاید اُسی لئے آپ بھی فلموں میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے......" میں نے اس سے کہا۔

"صرف یہی بات نہیں ہے۔" عرش چاقو سے پنسل کی نوک تیز کرتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ دیر تک چپ رہا۔ کچھ دیر تک ہونٹ سکوڑے گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

"بس معاملہ کچھ چلا نہیں.... آگے.....!"

چار چھ روز کی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بحث سے کتراتا ہے۔ اپنی دلیل پر زیادہ دیر تک نہیں ٹکتا۔ وہ کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے، دوسرے کو قائل کر دینے کا قائل بھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنی رائے دے گا۔ دے کر چپ ہو جائے گا۔ آپ نے اُس کی بات مان لی تو ٹھیک۔ ورنہ وہ آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ زیادہ باتیں کرنے سے کج بحثی سے۔ شیخی مارنے سے اُسے نفرت ہے۔ یہ سب خامیاں جس فلمی ادیب میں موجود ہوں۔ اس کا کامیاب ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ معلوم نہیں کس جھمیلے میں وہ پہلی دو سلور جوبلی فلمیں لکھ گیا۔!

اُس کی کامیابی کے راستے کے عین بیچ ضرور کچھ ہوا ہو گا۔ اب میں اتنے دن ملنے کے بعد محسوس کر سکتا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ اس کی مہذب شرافت، اس کا شرمیلا پن، اس کی باہر کی دنیا سے زیادہ نہ اُلجھنے کی خواہش اس کے راستے میں آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کامیابی

کی منزل سے بچھڑتا گیا۔ اور جتنا وہ بچھڑتا جاتا اتنا ہی وہ خود اور پیچھے ہٹتا جاتا۔ حتیٰ کہ کامیابی بہت دُور رہ گئی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی گردن کو ذرا سا خمیدہ کر کے کہہ رہا ہے۔ "جی ہاں۔ آپ آگے جائیے۔ آپ ہی آگے جائیے۔ آپ ہی آگے جائیے۔ میں پیچھے کو جاتا ہوں۔ آداب عرض!

سُنا ہے اُسے ایک لڑکی سے محبت ..... ہوئی تھی۔ وہ غالباً اُس کی فلم کی ہیروئن تھی۔ مگر بیچ میں پروڈیوسر کود گیا۔ اور پروڈیوسر ظاہر سے رائٹر سے بہتر آدمی ہوتا ہے۔ اُس نے عرش کی قابلیت اور کارکردگی کے باوجود اُسے اپنی دوسری فلم سے کاٹ دیا۔

عرش نے کہیں اور ملازمت کر لی۔ وہ فلم نہیں چلی۔ دوسری بھی نہیں چلی۔ اس کی وجہ سے نہیں۔ فلم نہ چلنے کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اسے وہ تکڑم بھی نہیں آتی تھی جس کے ذریعہ آدمی بڑی آسانی سے اپنی ناکامی کا بوجھ کسی دوسرے نالائق کے کندھے پر ڈال کر خود سرخرو ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرش بڑی تیزی سے زوال کی سمت جانے لگا۔ زوال کی بھی منزلیں ہوتی ہیں۔ آدمی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف اوپر ہی نہیں چڑھتا نیچے بھی اترتا ہے۔ پہلے دبی دبی شریفانہ مزاحمت، ایک قاعدے کی، سلسلے کی مخالفت۔ پہلے تو عرش نے اس زوال کے خلاف مزاحمت کی ہوگی۔ پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ پھر زندگی کی منزل پر آ کر عرش نے اپنے زوال سے مفاہمت کر لی ہوگی۔ اور اب وہ انتہائی دلی لگن اور انہماک سے اُس راستے پر گامزن تھا۔ اب وہ خود کوشش کر کے ہر اُس پتھر کو بیچ میں سے ہٹا دیتا تھا۔ جو اُسے نیچے جانے سے روک سکتا تھا!

مگر یہ سب کچھ مجھے بعد میں معلوم ہوا!

پہلے دن تو صرف معاملت کی بات ہوئی۔ تین سو روپے ماہانہ پر طے ہو گئی۔ اگلے

چھ ماہ کے لئے۔

عرش نے کہا۔

"مگر میں روز کے روز تنخواہ لوں گا۔ دس روپے روز۔!"

عرش نے کہا۔

"روز کے روز۔ کیوں؟ ماہ بہ ماہ کیوں نہیں۔ اکٹھی رقم ملنے سے آپ کو آسانی رہے گی۔!"

"جی نہیں۔ دقت رہے گی۔" اس نے جواب دیا۔ "روز کے روز ہی ٹھیک ہے۔!"

"اچھا چلئے۔ روز کے روز حساب کیجئے۔ دس روپے لیتے جائیے۔۔۔۔ صبح دس بجے آیئے شام پانچ بجے جائیے۔!"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال دو دن کا ایڈوانس دے دیجئے۔!"

عرش بیس روپے لے کر چلا گیا۔ پھر چار روز تک نہیں آیا۔ میں نے ملوانے والے سے شکایت کی۔ وہ میری بات سُن کر بہت ہنسا بولا عرش کسی بھٹی والے کے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا ٹھرا پی رہا تھا۔ جب تک وہ بیس روپے ختم نہ ہوں گے، نہیں آئے گا۔ آپ اس کو کبھی ایڈوانس مت دیجئے۔ شام کو جب کام کر کے جائے۔ دس روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیجئے۔!"

چوتھے دن عرش صبح صبح آ گیا۔ اُس نے ایسے کرب ناک لہجے میں اپنی بیوی کی شدید علالت کا ذکر کیا کہ وہ بالکل ایکٹنگ کرتا ہوا نہ معلوم ہوتا تھا۔ خیر میں نے پھر سے کام پر لگا لیا۔ تین دن تک بالکل ٹھیک سے کام کرتا رہا۔ چوتھے روز وہ کوئی بارہ بجے کے قریب آیا۔ اُس نے مجھے شکایت کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔" لوکل ریلوے کا پاس کھو گیا تھا، وہ آزردہ ہو کر بولا۔

میں نے اُسے لوکل کے پاس کے لئے ساڑھے آٹھ روپے دیئے۔ وہ روپے جیب میں

ڈال کر بولا: "سین لائیے!"

میں نے سین سمجھایا۔ دس پندرہ منٹ کام کر کے بولا: "اگر آپ اجازت دیں تو میں ریلوے اسٹیشن سے لوکل پاس بنا کے آجاؤں۔ شکل سے ایک گھنٹہ لگے گا۔ شام کو بے حد لمبا کیوں ہوتا ہے!"

"جائیے۔!"

عرش ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا۔ پھر اُس دن نہیں آیا۔ دوسرے دن آیا۔ دیر تک میں اس سے کچھ نہیں بولا۔ وہ بھی نہیں بولا۔ دونوں خاموشی سے کام کرتے رہے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔

"اتنا اچھا کام کرتے ہو۔ اتنا اچھا کام کرتے ہو!" میں بھڑک اٹھا۔ "اور کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ اس شراب کی خاطر!"

وہ کچھ نہیں بولا۔

ان دنوں مجھ پر سُدھار کا موڈ بہت غالب تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انفرادی کوششوں سے افراد بدلے جا سکتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں بدل دوں گا!"

"جی ــ!" وہ عاجزی سے بولا ــ

"تمہیں بدلنا ہو گا۔" میں نے غصّے سے کہا: "اتنا اچھا ادیب یوں گمنامی میں سڑتا رہے؟ میں اس فلم میں اپنے علاوہ تمہارا ٹائیٹل بھی ڈلوا دوں گا۔

اس کے چہرے پر کسی طرح کا تاثر پیدا نہ ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنی پنسل کی نوک تیز کرتا رہا۔

"تمہیں اپنی عادات بدلنا ہوں گی۔" اب میں نے دو ٹوک فیصلہ کن لہجے میں اسے حکم دینا شروع کیا۔

"یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ میرے ساتھ چلو بازار میں آج ہی ابھی تمہارے لئے نئے کپڑے خریدے جائیں گے۔!"

وہ کچھ بولا نہیں۔ مگر میری طرف رحم کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ہونٹوں کے خم سے معلوم ہوتا گویا کہہ رہا ہو۔ کیسے احمق سے پالا پڑا ہے۔" مگر کچھ بولا نہیں!

میں نے بازار سے اس کے لئے تین جوڑے کپڑے خریدے۔ تین پتلونیں۔ تین قمیضیں ریڈی میڈ۔ ایک جوتا۔ دو رومال۔ پھر اُسے شیونگ سیلون میں ڈھکیل دیا۔ پھر اُسے ایک حمام والے کے سپرد کیا۔ وہاں سے جو نکلا۔ تو اس کی جلد میں اس کے جسم کی اصلی رنگت جھلکنے لگی تھی۔ جب اس کے بزرگ سمرقند سے آئے ہوں گے تو یہی رنگت رہی ہو گی۔!

"اجی۔ جب میں پہلے پہل بمبئی آیا تو یہی رنگت تھی۔" عرش نے بڑی بیزاری سے کہا۔

"تھی کیا اب نہیں ہے؟"

"اب۔" وہ چُپ ہو گیا۔ اور اُس کی پتلیوں کے گرد غبار گہرا ہو گیا۔ پھر دیر تک نہیں بولا۔

"اب نہانے کو نہیں ملتا ہے روز روز۔" آخر اس نے کہا۔

"تم شراب کم کر دو — تو تمہیں نہانے کو روز ملے گا!"

"شراب کم کر دینے سے نہانا کم کر دینا بہتر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"دھیرے دھیرے بتدریج میں تمہاری شراب بھی کم کرادوں گا۔ تمہیں پھر سے انسان بنا دوں گا۔ میں پر زیادہ زور تھا میری گفتگو میں — جیسے وہ تو موم کا پتلا ہو!

"جی ..... جی .... بہت اچھا" وہ بھی میری گفتگو کے دوران میں نرم موم لہجے میں میری ہاں میں ہاں ملاتا رہا — !

"تم دن میں کتنی پی لیتے ہو؟"

"جتنی بھی مل جائے!"

"پھر بھی —؟"

"آدھی بوتل تو صبح ضروری ہے، نہار منہ — صبوحی آدھی دوپہر میں۔ رات کو ایک بوتل ڈیڑھ بوتل، دو بوتل — رات کو جتنی بھی مل جائے —!"

"تمہیں اپنی عادت کے خلاف جدوجہد کرنا پڑے گی۔" میں نے اس سے کہا۔ صبح کو تمہیں آدھی بوتل ملے گی۔ دوپہر میں آدھی بوتل، شام کو چلتے وقت تمہیں ایک بوتل کے پیسے دے دوں گا۔ باقی رقم ماہ بہ ماہ تمہارے گھر پہنچا دی جائے گی۔ تمہاری بیوی کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ تم کو باقی ماندہ تنخواہ میں سے ایک پیسہ نہیں ملے گا —!"

"ماہ بہ ماہ۔ روز کے روز دیجئے گھر پہ بھی —!"

"اچھا پندرہ روز کے بعد دے دوں گا!"

"جی نہیں روز کے روز!"

"روز کے روز کیوں؟"

"راشن لانا ہوتا ہے!"

"تمہارے ہاں کیا روز راشن آتا ہے۔ راشن تو ہفتے کے ہفتے آتا ہے۔ لہٰذا ہفتے کے ہفتے تمہارے گھر پر رقم پہنچ جائے گی۔ مگر تمہیں نہیں ملے گی۔ تمہیں شراب چاہیئے نا۔ وہ تمہیں مل جائے گی اور کیا چاہیئے؟"

"بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔" پھر وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا! کوئی آٹھ دس روز ٹھیک کام چلا۔ وہ وقت پر آتا تھا۔ کپڑے بھی صاف ستھرے پہن کر آتا تھا۔ شیو بھی بنی ہوتی تھی۔ لہجے میں ایک نئے اعتماد کی جھلک ملنے لگی۔ میں بہت خوش ہوا۔ اب اگلا تجربہ شروع کرنا چاہیئے۔

میں نے آٹھ دس روز کے بعد اُس سے کہا۔ "آج سے دوپہر میں تمہیں شراب نہیں ملیگی۔!

وہ ایک عجب تذبذب کے عالم میں دیر تک میری طرف گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ ٹھیک ہے!"

دوپہر کو اُسے شراب نہیں دی گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ کسی طرح کی وحشت نہیں ظاہر کی۔ اطمینان سے کام کرتا رہا۔ سہ پہر کو کوئی ساڑھے چار بجے کا عمل ہوگا کہ اس کی آنکھوں میں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ؟

"روتے کیوں ہو؟" میں نے ترش سے پوچھا۔

"روتا نہیں ہوں۔ آنکھ سے پانی بہتا ہے۔" اس کی آواز میں کسی طرح کی اُداسی یا لرزش نہیں تھی۔ !

"کیوں بہتا ہے؟

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب شراب نہیں ملتی ہے۔ تو آنکھوں سے پانی گرنے لگتا ہے!"

" وہ بار بار رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرتا جاتا تھا۔ مگر آنسو برابر اس کی آنکھوں سے بہے جاتے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اس کی یہ حالت ہوگئی گویا آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ رہے تھے۔ مگر کوئی شکایت نہیں کر رہا تھا۔

عاجز آکر میں نے جلدی سے اُس کے لئے ٹھرّا منگایا۔ دوسرے پیگ میں اُس کے آنسو بہنے بند ہوگئے۔ !

مگر میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ دوسرے دن میں نے اُسے پھر دوپہر کے

وقت ٹھرا نہیں پینے دیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تو میں نے اور اس نے دونوں نے صبر کیا۔ پھر ہوتے ہوتے اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ اس کا سارا جسم ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔

پھر ٹھرا پلاتے ہی ٹھیک ہو گیا۔

بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں اُسے ڈاکٹر سنگھل کے ہاں لے گیا۔ ڈاکٹر سنگھل ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ اُس نے بڑی ہمدردی سے عرش کا معائنہ کیا۔ دیر تک معائنہ کرتا رہا۔ آخر کار میری طرف مُڑ کر کہنے لگا۔

”آپ کا دوست الکوہلزم کا شکار ہے۔ بہت پُرانا مرض معلوم ہوتا ہے۔!“

”پھر کیا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔؟“

”محض دواؤں سے ٹھیک نہیں ہو سکتا!“

”تو کیا کرنا چاہیئے؟

اسے چھ ماہ تک کسی نرسنگ ہوم میں رکھنا پڑے گا۔ چوبیس گھنٹے نگرانی میں رکھنا پڑے گا۔ الکوہلزم کے مریض پر کڑی نگرانی رکھنا پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ شراب کی مقدار کم کر دی جاتی ہے۔ ساتھ میں دوائیں دی جاتی ہیں۔ بالعموم مریض چھ سات ماہ میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔!“

”پورے علاج پر کتنا خرچ آئے گا۔؟“

ڈاکٹر نے حساب کر کے بتایا ”اگر چالیس روپے روز والا کمرہ بھی لیں تو بارہ سو تو یہی ہو گیا۔ تین سو خوراک کے سمجھ لیجئے ہو گئے پندرہ سو۔ باقی پانسو دوا دارو کے لگا لیجئے۔ دو ہزار روپیہ مہینہ کا تخمینہ پڑے گا۔ چھ ماہ میں بارہ ہزار خرچ ہوں گے۔ دو تین ہزار اوپر کے لکھ لیجئے!“

پندرہ ہزار!

پندرہ ہزار ایک ذہین، لائق، قابل آدمی کو بچانے کے لئے زیادہ نہیں ہیں۔ مگر پندرہ ہزار کون دے گا۔ یہ دنیا کسی غریب کو ایک وقت کی روٹی تو دے سکتی نہیں۔ پندرہ ہزار کہاں سے دے گی؟ خود میرے اپنے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں رقم اُس پر خرچ کر سکتا۔ پندرہ ہزار تو کیا۔ میں اس رقم کی ایک چوتھائی بھی فی الحال اس پر خرچ کرنے سے قاصر تھا۔

میں عرش کو ڈاکٹر کے ہاں سے لے کر چلا آیا۔

میرا شوق ٹھنڈا پڑنے لگا۔ یونہی ہوتا ہے۔ سُدھار کرنے کے لئے نکلتا ہوں۔ بیچ میں ایک بہت بڑی اونچی دیوار آجاتی ہے۔ جسے توڑنے کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں....... سر جھکائے واپس چلا جاتا ہوں۔ مگر کوئی تو راستہ ہو گا۔

ایک دن ٹھرا پینے میں میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ ٹھرا پی کر اس دن وہ مجھ سے بہت کُھل گیا۔ جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ آج فلم کی ایک مشہور اداکارہ ہے۔ اس کی بیوفائی کا گھاؤ آج تک اس کے دل میں تازہ ہے۔ پھر اُس نے مجھے اپنی کئی غزلیں سنائیں اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے۔ جو ہٹ کے کہتا ہے۔!

"تو تم اپنا کلام چھپواتے کیوں نہیں ہو؟"

"کیونکہ مجھے اپنے زخم دکھانے کی عادت نہیں ہے۔" وہ بڑی تلخی سے بولا۔

میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ رہا۔ یہ پورا پیگ خاموشی میں گزرا۔ پھر موضوع بدل دیا گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر میرے ذہن کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ دو تین پیگ کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری اس عظیم الشان ناکامی کا راز کیا ہے؟

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔ "میں دھکا نہیں دے سکتا!"

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا۔ پھر اس نے ایک لمبا گھونٹ پی کے اُلٹے ہاتھ سے اپنے پیلے ہونٹ صاف کئے اور میری طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولا "جب میں کامیابی کے اونچے زینے پر کھڑا تھا۔ اور اوپر جانے کے لئے پر تول رہا تھا تو اُسی سیڑھی پر، اسی زینے پر دو تین آدمی اور بھی تھے اور وہ میرے ساتھ ایک ہی سیڑھی پر کھڑے تھے اور جگہ بہت ہی تنگ تھی۔ اوپر جانے کی ایک ہی صورت تھی، یا تو وہ مجھے دھکا دیتے یا میں انہیں دھکا دے دیتا۔ مگر میں اس پوزیشن میں ہونے کے باوجود انہیں دھکا نہ دے سکا۔ کسی طرح میرا ضمیر آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔!

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ اپنے خالی گلاس پر غور کرتے ہوئے بولا۔

"پھر انہوں نے مجھے دھکا دے دیا۔!"

عرش میرے ساتھ زیادہ دن نہیں چل سکا۔ دو ماہ کے عرصہ ہی میں وہ مجھ سے عاجز آ گیا۔ روز شیو بناؤ، روز صاف کپڑے پہنو۔ روز وقت سے آؤ، وقت سے جاؤ۔ شراب کم پیو، بیوی کو زیادہ پیسے دو۔ یہ کیا بیہودگی ہے! اس نے سوچا ہوگا.... پھر وہ بیچ بیچ میں ناغے کرنے لگا۔ ایڈوانس مانگنے لگا۔ آج بیوی بیمار ہے تو کل بچہ بیمار ہے۔ پرسوں وہ خود بیمار ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھا ادیب اور شاعر تھا اس لئے اُس کے بہانے بھی بڑے عمدہ اور متنوع ہوتے تھے۔ اُنہیں سن سن کر کچھ عرصہ کے لئے یقین آ جانا لازمی تھا۔ مگر تابکے۔

جوں جوں اُس کے تقاضے بڑھتے گئے۔ اس کے ناغے بھی بڑھتے گئے۔ کپڑے بھی گندے اور میلے ہوتے گئے، داڑھی بھی بڑھتی گئی۔ شراب کی مقدار بھی بڑھتی گئی۔ آخر دو ماہ کے بعد جس دن وہ مجھ سے لڑ کے گیا ہے۔ اُس روز وہ اتنا ہی کثیف، گندا اور میلا تھا جتنا کہ پہلے روز جب

وہ مجھ سے ملنے اور کام لینے کی غرض سے آیا تھا.....!

اس کے بعد ایک سال تک میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ دوسرے سال کا ذکر ہے، میری نئی پکچر "آئی رُت بہار کی" کی شوٹنگ شروع ہوئے تین چار ماہ گزر چکے تھے۔ میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ میرے سامنے کی کھڑکی کھلی تھی۔ کُھلی کھڑکی سے برآمدہ اور برآمدے سے باہر باغ کا ایک حصّہ نظر آرہا تھا۔ آم پر بور آیا تھا۔ فضا مست اور سہانی تھی۔ دماغ میں کوئی عشقیہ کہانی تھی کہ اتنے میں کسی نے کھڑکی کے قریب آکر زور سے کھنکارا۔!

میں نے چونک کر دیکھا۔ اتنے میں کسی جانی پہچانی بیزار کُن گاڑھی ہنسی سنائی دی۔ یہ عرش تھا۔ کھڑکی کے باہر فریم سے لگا۔ حلیہ پہلے سے بدتر۔ جسم پہلے سے دُبلا آنکھیں پہلے سے زیادہ میلی اور گڑھے میں دُھنسی ہوئی۔ کپڑے پھٹے اور تار تار۔ اور جسم سے ایسی بدبو آتی تھی کہ ناک پر رومال رکھنے کو جی چاہتا تھا۔!

دیر تک میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑا میری طرف دیکھ کر ایک عجیب کھسیائے ہوئے انداز میں مسکراتا رہا۔ کچھ عجیب اُلجھا اُلجھا۔ پریشان، سٹپٹایا ہوا سا کھڑا رہا۔ خاموش کھڑا رہا۔!

"کہو؟" میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے انتہائی درشت لہجے میں اس سے سوال کیا (اپنے ناکام تجربے کو کون دہرانا چاہتا ہے۔)

"کام چاہیئے۔!" اس نے اپنے گاڑھے تلخ لہجے میں کہا۔

"لکھنے کا کوئی کام میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے اُسے فوراً جواب سنا دیا۔!

"لکھنے کا کام مجھے چاہیئے بھی نہیں۔" اس نے سر ہلا کر مجھ سے کہا۔

”پھر کون سا کام؟

”وہ جو نئی آپ کی فلم بن رہی ہے ”آئی رُت بہار کی“ جس کے چند سین میں نے لکھے ہیں اس فلم میں کوئی چھوٹا سا کام مجھے بھی دلوا دیجئے۔!“

”کس طرح کا؟“

”ایکسٹرا کا رول بھی مل جائے تو غنیمت ہے!“

میں دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ یہ عرش ہے میرے سامنے..... ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مکالمہ نگار..... تین کامیاب تصویروں اور دو سلور جوبلی کا خالق....؟ یہ اپنے لئے فلموں میں ایکسٹرا کا رول کرنے کے لئے تیار ہے، مگر اب یہ لکھے گا نہیں۔ کیوں نہیں لکھے گا۔ دوسروں کے لئے نہیں۔ کیونکہ شاید اس شدید ابتری اور گہرے زوال کے باوجود کہیں پر اس کے دل کے اندر اپنے پیشے کی صحیح عزت اور عفت محفوظ ہے۔ محفوظ رکھنا چاہتا ہے کیا؟ کیا اسی لئے نہیں لکھے گا۔ اور اپنی شراب کے دام ایکسٹرا کا رول ادا کر کے حاصل کرے گا.....؟ یا یہ بات ہے کہ مسلسل شراب خوری سے لکھنے کی صحیح صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے۔ جانے بات کی اصل صداقت کیا ہے؟ میں نے مزید غور و خوض کئے بغیر اُسے فلم کے ڈائرکٹر کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ اس خط کی بنا پر اُسے میری لکھی ہوئی فلم میں کام مل بھی گیا۔ سات آٹھ روز کے بعد اس سیٹ کی شوٹنگ ہونے والی تھی۔ جس میں عرش کو کام کرنا تھا۔

جس دن اس کی شوٹنگ تھی۔ وہ دوپہر میں لنگڑاتا ہوا میرے گھر پر آگیا۔ اور میرے مطالعہ کے کمرے کے باہر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے میلے کچیلے رخسار الکوحل کی حدت سے سُلگ رہے تھے۔ اور آواز میں شرابیوں کی سی لُکنت تھی اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اُسے اس حالت میں دیکھتے ہی مجھے غصہ آگیا۔

کیوں۔ کیا ہوا۔ کام پر نہیں گئے۔ آج تمہاری شوٹنگ تھی نا؟" میں نے اس سے ڈپٹ کر پوچھا۔

"تھی۔" اُس نے شرابی لہجے میں کہا۔

"پھر، گئے نہیں وہاں ۔۔ ؟"

"گیا تھا ۔۔ !"

"تو کیا شوٹنگ ختم ہوگئی ؟

"نہیں ....." وہ رُکا پھر اکدم بول پڑا۔ "انہوں نے مجھے نکال دیا !"

"کیوں نکال دیا ۔ ؟"

"کہنے لگے تم مکالمے ٹھیک سے ادا نہیں کرتے ہو !"

"یوں بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے زیادہ پی رکھی ہوگی !"

"یہ تو میں نے بعد میں پی ہے۔" عرش نے بے بسی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"اس وقت تو معمول کے مطابق پی رکھی تھی اسسٹنٹ ڈائرکٹر مجھے الفاظ کا تلفظ بتا رہا تھا۔ یوں بولتے ہیں، یوں نہیں بولتے ہیں۔ میں سر ہلا ہلا کے جی ہاں جی ہاں کہتا گیا۔ مگر جب کیمرے کے سامنے کام کرنے کا موقع آیا۔ تو میں وہی بولا جو مجھے بولنا چاہیئے تھا۔ اس پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کو بہت تاؤ آگیا اور اس نے مجھے سیٹ سے باہر نکال دیا ۔ !"

اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ اس کی ہنسی بڑی خوفناک تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے خون سے اس کا حلق بھر گیا ہو ۔ !

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟"

"بات یہ ہے۔" وہ ذرا سا سر جھکا کے بولا۔ "وہ سین میرا ہی لکھا ہوا تھا۔

بیچ بیچ میں لمبے لمبے وقفے آتے ہیں۔ چھ ماہ کے۔ سال کے دو سال کے، وہ کبھی کبھار مجھ سے ملتا ہے۔ کسی شدید ضرورت سے مجبور ہو کر..... اس کا بیٹا مر گیا ہے، اس کی ماں مر گئی ہے، بہن پاگل ہو گئی ہے..... چھ ماہ سے جھونپڑے کا کرایہ نہیں دیا..... عید آئی ہے ..... ایک دفعہ اس کی بیوی کا آپریشن ہونے والا تھا نانا وتی ہسپتال میں۔ اُسے فوری طور پر ایک سو روپیوں کی ضرورت تھی۔ میرے پاس صرف بیس ۲۰ روپے تھے۔ وہ میں نے دے دیئے۔ مگر باقی اسّی روپیوں کے لئے میں دن بھر بھٹکتا رہا۔ شام کو جب مل گئے تو انہیں لے کے نانا وتی ہسپتال پہنچا۔ جو وارڈ اس نے بتایا تھا۔ جو بیڈ نمبر اس نے بتایا تھا وہاں پر عرش نہ تھا، نہ اُس کی بیوی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی بیوی گھر پر اپنے میاں کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اور عرش صاحب کسی جھونپڑے میں بیٹھے ٹھرا پی رہے تھے۔ اس قدر مجھے غصّہ آیا ہے اُس دن اس پر۔ اور میں ایسا بیوقوف بنا ہوں؟ مگر اس کی اُس دن کی ایکٹنگ بھی لاجواب تھی۔ اس قدر زار و قطار وہ رو رہا تھا کہ مجھے اُس کے آنسو بالکل پرخلوص معلوم ہوتے بار بار چوٹ کھانے کے بعد اس بار پھر میں اُس سے چوٹ کھا گیا جی چاہا کہ کہیں اگر مل جائے تو مار مار کر اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں۔ مگر اس واقعہ کے بعد تقریباً دو سال تک وہ میرے نزدیک نہیں پھٹکا۔ وہ ماہر نفسیات بھی تھا۔

پھر اس واقعہ کے کوئی دو سال بعد میرے ایک شاعر دوست کے بنگلے پر فراقؔ صاحب کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی تھی۔ اسکاچ کی ایک درجن سے زیادہ بوتلیں کھلی تھیں۔ لم انڈسٹری کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب، گلوکار اور موسیقار مدعو تھے۔ عورتوں کے پرے بانے سجے پوری زیوروں اور نئی بالک ساڑیوں میں ملبوس گلاب کے تختوں کی طرح مہک ہے تھے۔ محفل شباب پر تھی۔ چاروں طرف نور اور رنگ، شراب اور نغمہ، شاعری اور خوشبو

کی دھنک پھیلی ہوئی تھی۔ کہ کسی نے آ کے مجھ سے کان میں کہا" ایک صاحب آپ کو باہر بلاتے ہیں ۔۔!

میں باہر گیا۔ برآمدے میں کوئی نہ تھا۔!

میں نے پوچھا" وہ صاحب کہاں ہیں؟"

"گھر کے باہر کھڑے ہیں ۔۔!"

دو تین برآمدوں سے گزر کر سیڑھیوں سے اُتر کر میں گھر کے باہر گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے بمبئی سے دور سات بنگلے کے مقام پر کون مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے؟

گھر کے باہر عرش کھڑا تھا۔!

مجھے دیکھ کر زور سے ہنسا، بولا" آپ نے ایک بار کہا تھا ناں، کہ تم ہمیشہ جھوٹ بول کر مجھ سے پیسے لیتے ہو ۔۔ آج سچ سچ کہہ رہا ہوں، مجھے شراب کے لئے پیسے چاہیں، اور صرف شراب کے لئے .... بس ....!

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اب اُس کی حالت بہت بگڑ گئی تھی، اور وہ بہت دور نیچے کو نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے عرش کو اس کے پھٹے پرانے فقیروں کے سے چیتھڑوں میں ملبوس سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آخر وہ ہمیں میں سے ایک تھا۔ اس نے بھی کئی کامیاب پکچریں لکھی تھیں۔ آج بھی اس کے قلم میں وہی زور تھا جو اُس کے ہم عصروں میں تھا۔ جو اندر اس مہکتی ہوئی گلزار محفل میں بیٹھے دعوتِ ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ جن کے گھروں پر کی طرح جاتا تھا۔ جن کی کھڑکیوں کے باہر وہ ایک سوالی کی طرح چپ چاپ کھڑا ہو جاتا تھا۔ جن کے نام ادبی اور فلمی پرچوں کے پہلے صفحے پر آتے تھے۔ وہ ان میں سے کسی ایک سے بھی قابلیت، لیاقت اور فنی صلاحیت

کم نہیں رکھتا تھا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اُسے شراب نے مارا۔ آخر کتنی شراب پیتا تھا وہ۔ آدھی بوتل صبح، آدھی دوپہر اور ایک رات کو کُل دو بوتلیں ٹھرّے کی، جو اس زمانے میں چھ سات روپے کی ہوتی تھیں۔ کل چھ روپے کی شراب وہ پیتا تھا۔ اتنی شراب تو یورپ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کے کروڑوں لوگ شب و روز پیتے ہیں اور عزت اور عافیت سے زندہ رہتے ہیں۔ چھ روپے کی شراب کیا بہت ہو گئی ایک فن کار کے لئے ....؟ ہم لوگ خوبصورت روشنیوں اور رنگوں کے ہالے میں اور وہ اس سے باہر تھا۔ اندر جام لنڈھائے جا رہے تھے اور باہر وہ پیاسا کھڑا تھا۔ میں مبہوت ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ میرا ماضی ہے؟ یا مستقبل؟ کیوں اس طرح سے سر جھکائے کھڑے ہو عرش۔ کیوں مانگ مانگ کر پیتے ہو۔ کیوں تمہیں دوسروں کی طرح دنیا داری کی چالیں، سازشیں، تکڑمیں اور فریب نہیں آتے۔ اندر ہم لوگ اسکاچ پی رہے تھے۔ کیونکہ زندگی کے کسی مرحلے پر ہم نے کسی دوسرے کو دھکّا دیا تھا۔ اور تم سے ایک دھکّا نہ دیا گیا۔ ارے کس کے لات ماری ہوتی ظالم، تو آج اس زبوں حالت میں میرے سامنے تو نہ کھڑے ہوتے....؟

یکایک وہ زور سے ہنسا۔ جیسے سوڈے کی بوتل پھٹ گئی اور تیز کانچ کی کرچیں چاروں طرف بکھر گئیں۔ "کیوں کیسی نفسیاتی چوٹ کی میں نے"۔ وہ طنز آمیز لہجے میں شدید حقارت سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

یکایک میرے سارے نرم گرم۔ رحمدلی اور ہمدردی کے جذبے اس کے لئے اُس کی گاڑھی غلیظ ہنسی میں دب گئے۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ تو یہ سارا ڈرامہ اس لئے کھیلا گیا تھا کہ اس تضاد کو دیکھ کر ایسے خیال میرے دل میں آئیں۔ اور عرش اُن سے فائدہ اٹھا کے مجھ سے پورے روپے لے جائے۔!

میں نے دانت پیس کر کہا "کمینے!"

اس نے سر جھکا کے ہاتھ بڑھا کے کہا "آداب عرض کرتا ہوں!"

اس وقت اُس سے اُلجھنا فضول تھا۔ میں نے جلدی سے جیب سے نکال کے اسے دس روپے دیئے اور واپس ہو لیا۔ لوٹ ہی رہا تھا کہ اس کی آواز آئی۔

"اندر سے نثار کو بھیج دیجئے گا۔ اسے بھی نفسیاتی چوٹ دوں گا —"

اُس رات عرش نے ایک سو روپے اکٹھے کر لئے تھے۔ مگر میں نے بھی طے کر لیا تھا۔ کچھ ہو جائے اب عرش کو کبھی منہ نہ لگاؤں گا —!

مگر یہ زندگی اس قدر عجیب ہے کہ یہاں کوئی قولِ فیصل بہت دیر تک نہیں رہتا۔ چند ماہ کی خفگی کے بعد میں پھر اسے کام دینے لگا۔ اب وہ میرے اور دیگر ادیبوں کے مسودے نقل کرتا تھا۔ جو ملتا اس میں سے ایک چوتھائی گھر دے دیتا۔ تین چوتھائی رقم کی شراب پی جاتا۔ اب اس پر کسی گالی، جھاڑ، طعنے، شکوے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب وہ زیادہ باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ چونکہ کسی زمانے میں وہ کاتب بھی رہ چکا تھا۔ اس لئے اس کا خط بہت اچھا تھا۔ میرے مسودوں کی نقل کا کام زیادہ تر اسی کو دیا جانے لگا۔ ہولے ہولے اس نے پھر اپنا رنگ مجھ پر جما لیا۔ یہاں تک کہ جب ایک بار میری بیوی اپنے میکے چلی گئی۔ تو میں نے اُسے کھڑکی میں کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے گھر کے اندر آنے اور پھر گھر میں بیٹھ کر کام کرنے کی دعوت دے دی۔ اب، ہم لوگ اکٹھی چائے پیتے، کبھی کبھی اکٹھے کھانا کھاتے۔ وہ مجھے اپنی خوش حالی کے زمانے کی داستانیں سُناتا۔ اور اپنے جاننے والوں پر عمدہ طنزیہ فقرے کستا۔ لگتا تھا جیسے اب بھی اس کی ذہانت میں کوئی چنگاری باقی ہے۔

ایک دن میں چند گھنٹوں کے لئے اسے گھر میں اکیلا چھوڑ گیا۔ مجھے کسی کام سے باہر جانا

تھا۔ اور جو مسودہ وہ نقل کر رہا تھا۔ اُسے آج ہی ڈاک سے بھیجنا تھا۔ اس لئے میں اُسے گھر میں کام کرتا چھوڑ گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب واپس آیا، تو وہ اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ وہ بھڑک کر کہنے لگا۔

”ہاں دیکھ لو..... دیکھ لو..... میں نے کچھ نہیں چُرایا ہے تمہاری بیوی کے چاندی کے برتن تک محفوظ ہیں۔ اور وہ علی گڑھی پاندان بھی..... اچھی طرح سے دیکھ لو۔۔!“

”کیوں شرمندہ کرتے ہو عرش..... میں تو یونہی..... !“

”یونہی نہیں جناب۔ ٹھیک سے سارے گھر کی تلاشی لے لو۔ ممکن ہے کوئی چیز غائب ہو۔!“

میں شرمندہ ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کام ختم ہو گیا۔ تو میں نے اُسے پیسے دے دیئے۔ پیسے لے کر وہ چلنے ہی والا تھا کہ میں نے اُسے چائے پی کر جانے کو کہا۔ اُس نے بہت انکار کیا۔ لیکن میں نے اصرار کر کے بٹھا لیا۔ جب چائے تیار ہوئی تو میں نے کچن میں چمچے ڈھونڈنے لگا۔ دیکھا تو کچن میں ایک چمچہ بھی موجود نہیں ہے۔ پچاس ساٹھ چمچے تھے سب غائب۔!“

میں نے عرش کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کچن میں تو ایک چمچہ بھی نہیں۔!“

عرش فوراً بھڑک کر بولا ”کیا تم مجھے چمچے کے بغیر چائے نہیں پلا سکتے، کھانا نہیں کھا سکتے۔ زندہ نہیں رہ سکتے..... ؟“

اس دن میں نے پھر عرش کو گھر سے نکال دیا اور قسم کھائی آئندہ کے لئے ختم۔!

مگر اس واقعہ کے چند ماہ بعد وہ پھر میری کھڑکی میں آموجود ہوا۔ بہت دُبلا اور نحیف دکھائی دیتا تھا۔ پیٹ پر ایک موٹی پٹی باندھ رکھی تھی۔ جس سے اس کا پیٹ ابھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لمبے لمبے سانسوں کے درمیان بولا ”بہت بیمار ہوں، خونی پیچش ہو گئی ہے۔ مجھے پچیس روپے دے دو۔!“

"یہ بہانے بازی اب نہیں چلے گی۔" میں نے گرج کر اس سے کہا "چلے جاؤ۔"

"نہیں۔ سچ مچ بیمار ہوں، واقعی۔۔۔ بیس روپے ہی دے دو۔ میری حالت دیکھو۔" وہ اپنے پیٹ کی پٹی کھولنے لگا۔!

"رہنے دو رہنے دو۔ اب یہ ایکٹنگ یہاں نہیں چلے گی!"

"اچھا تو کوئی کام دے دو۔ مسودہ نقل کرنے کے لئے۔۔۔ اور کچھ ایڈوانس دے دو۔ پندرہ روپے ہی دے دو۔۔۔۔!"

"ایک پیسہ نہیں ملے گا۔" میں نے انتہائی دُرشتی سے اُسے جواب دے دیا۔ اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔!

چوتھے دن مجھے معلوم ہوا کہ عرش مر گیا۔ میں شمبھو پان والے کی دکان پر کھڑا مگھی پان کا جوڑ کھا رہا تھا کہ شکیل بدایونی کے ایک نوکر نے جو اُن کے گھر سے تین پانوں کا آرڈر لے کر آیا تھا۔ مجھے پہچان کر اور سلام کر کے کہا "آپ کو معلوم نہیں عرش صاحب مر گئے۔!

ایک دھچکا سا لگا۔ تو کیا وہ سچ کہتا تھا؟ واقعی بیمار تھا؟

"کب؟ میں نے اس سے پوچھا۔

"آج صبح۔" نوکر نے جواب دیا۔ "ان کے گھر سے ایک لڑکا آیا تھا۔ شکیل صاحب وہیں گئے ہیں۔!"

میں نے ایک ٹیکسی بلائی اور عرش کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

وہ سانتا کروز ویسٹ کے ایک جھونپڑے میں رہتا تھا۔ قریب میں بھینسوں کا ایک شیڈ تھا۔ ایک شیڈ میں بھینسوں کے لئے چارہ بھرا تھا۔ قریب میں دوردیں بہہ رہی تھیں۔ ان کو پھلانگ کر عرش کے جھونپڑے تک پہنچ سکتے تھے۔ عرش کی لاش جھونپڑے کے عین بیچ میں رکھ

تھی۔ بیوی جو قبل از وقت بوڑھی ہو گئی تھی۔ ہولے ہولے بین کر رہی تھی۔ عرش کے بچے کچھ نیم برہنہ کچھ ننگ دھڑنگ اپنے باپ کی لاش کے گرد نیم دائرہ بنائے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ سب سے چھوٹے لڑکے امجد کی عمر چار سال کی۔ اس کی ماں نے اُسے دوسرے محلے میں کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا۔!

عرش کا چہرہ صاف، سفید اور سُتا ہوا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں پہلی بار میں نے ان آنکھوں کا رنگ دیکھا۔ ایک ہزار برس پہلے جب تم سمرقند سے چلے ہو گے تو یہی آنکھیں لے کے چلے ہو گے۔ کہاں کہاں پہنچے۔ اس کا مجھے غم نہیں ہے۔ غم صرف اس بات کا ہے کہ یہ آنکھیں زندگی میں بھی اسی طرح صاف اور نیلی کیوں نہ دکھائی دیں۔ جیسی پُرسکون اور صاف تمہاری موت ہے۔ ایسی ہی زندگی تمہیں کیوں نہ ملی؟

دو تین بچے ناک سڑک رہے تھے۔ کہ سسکیاں لے رہے تھے۔ کہ حیرت سے اُن آنے جانے والے خوش پوش آدمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس جھونپڑی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ ان بچوں کو حیرت غالباً اس بات کی تھی کہ ایسے خوش لباس انسان اس سے پہلے اس جھونپڑے میں کیوں نہ آتے تھے۔ ان کے فاقہ زدہ جسموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ عرش کی مصیبت تو کٹ گئی۔ اب ان کی شروع ہونے والی ہے۔!

حالانکہ وہ میرے سامنے دفن ہوا۔ مگر یقین نہیں آتا۔ کتنے ہی دن میں کھڑکی کھولے اس کا منتظر رہا۔ خیال تھا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری کھڑکی کے قریب آ کر رُک جائے گا۔ اور میں اُسے وہ پچیس روپے دے دوں گا۔ کسے معلوم تھا کہ بالکل آخر وقت میں وہ بالکل سچ بول کر مجھے چکما دے جائے گا۔!

اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لئے مجھے اس بار پچیس روپیوں سے زیادہ خرچ کرنے پڑے حالانکہ

اس وقت صرف پچیس روپوں میں کام چل سکتا تھا۔

مگر اب عرش کو واپس نہیں بلا سکتا تھا۔ ان مردوں میں ذرا سی انسانیت نہیں ہے زندوں کو اس طرح تنگ کرنے کا انہیں کیا حق ہے۔

ایک دوست نے اس کے جھونپڑے کا سات ماہ کا کرایہ ادا کیا۔ ایک دوست نے دو ماہ کا راشن بھر دیا میں نے اس کی بیوی بچوں کے لئے کپڑے بنوا دیئے۔

عرش کے تیجے پر میں اس کے جھونپڑے میں گیا تو چار سال کا ننھا امجد ایک نئی قمیض پہنے اپنی اماں کی گود میں بیٹھا تھا اور خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

"اماں نوی قمیج!"

مجھے دیکھ کر عرش کی بیوی نے ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اور آنسو بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں بیٹا.... تیرے ابا مر گئے ہیں ناں تو یہ انہوں نے.... تیرے ابا کے دوست نے تیرے لئے قمیض بنوا دی ہے۔

"انہیں سلام کر دو بیٹا۔!"

مگر ننھا امجد ابھی صرف چار سال کا تھا۔ ابھی اُس نے کسی کو خوشامد سے سلام کرنا نہیں سیکھا تھا۔ ابھی اسے یہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ مرنا کسے کہتے ہیں؟ دوست کون ہوتا ہے؟ اپنی ماں کی بات سے صرف اتنا پتہ چلا کہ اس کے ابا مر گئے ہیں۔ اور آج اسے نئی قمیض ملی ہے۔

یہ جان کر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے معصوم ماتھے پر سوچ کی ایک گہری شکن نمودار ہوئی۔ اور اس نے اپنی نئی قمیض کے دامن میں اپنی انگلی پھنسا کر اپنی اماں سے پوچھا۔

"تو اماں.... تو.... ابا اس سے پہلے کیوں نہ مر گئے۔

کیا کروں

ساڑھے نو کے قریب سردار سدا بہار سنگھ کے فلم پروڈکشن ۱ چل چل رے کوچوان کے پہلے دو گانوں کی صدا بندی لکشمی سٹوڈیو میں ختم ہو گئی۔ سردار سدا بہار سنگھ فلم انڈسٹری میں نووارد تھا۔ اس لئے صدا بندی سے پہلے ماسٹر اچھن راؤ نے، گیت گانے والی مس دھنا سری نے، اور ساز بجانے والوں نے اپنے پیسے وہیں سٹوڈیو میں وصول کر لئے۔ صدا بندی کے فوراً بعد ساز بجانے والوں کو خیال آیا کہ اس موقعے پر سب سے قریب کا شراب خانہ رے روڈ پر پڑے گا۔ یوں تو سبھی پینے والے تھے۔ لیکن چھوٹی آنکھوں اور لمبی داڑھی والا سر مکھ سنگھ ڈھولکیا اور وائیلن بجانے والا ڈی میلو اور بانسری بجانے والا نواز جو خود بھی اتنا دبلا پتلا تھا کہ دور سے دیکھنے پر اگر وہ خود بھی ایک چلتی پھرتی بانسری نہیں تو بانس کی کھپچی ضرور نظر آتا تھا۔ یہ تینوں اس وقت بری طرح پیاسے نظر آ رہے تھے۔ انہیں اس وقت لکشمی اسٹوڈیو سے رے روڈ کے شراب خانے تک پیدل جانا بھی

کھل رہا تھا۔ اس لئے ان تینوں نے ماسٹر اچھن راؤ کی پے کارڈ کو گھیر لیا حالانکہ اُس میں اسوقت ماسٹر جی کی محبوبہ مس دھناسری بھی بیٹھی ہوئی تھی مگر شراب کا عشق عورت کے عشق سے کوئی کم نہیں ہوتا۔ اور پینے والے تو کہتے ہیں، شراب کا نشہ عورت کے نشے سے برتر اور فائق ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے جو صدیوں سے جاری ہے اور شاید صدیوں آگے چلتی رہے گی۔ اس لمحے بھی تو یہ تینوں مس دھناسری کا سب ادب و احترام کھو کر ماسٹر اچھن راؤ سے التجا کر رہے تھے کہ وہ انہیں ذرا سی ذرا بیں رے روڈ کے شراب خانے پر اتار دے۔

"تجھ پر سائیں بابا مہربان ہو ماسٹر!" سرکھ سنگھ میراثیوں کے انداز میں بولا۔

ماسٹر اچھن راؤ نے مسکرا کر دھناسری کی طرف دیکھا۔ سانولے رنگ کی، سبک، نازک لڑکی آنکھیں جھکائے ایک کونے میں دبکی پڑی تھی۔ اس نے ماسٹر اچھن راؤ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ لیکن اچھن راؤ کو معلوم تھا کہ مس دھناسری اس وقت اس گاڑی میں ایک سلمے کے لئے ان سازندوں کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتی نازک صورت حال تھی۔ ادھر سازندوں کا پیہم اصرار۔ ادھر سانولی صورت کا خاموش احتجاج۔ ماسٹر اچھن راؤ نے ایک زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔

بیٹھ جاؤ گاڑی میں کمبختو! سائیں بابا کی قسم دے کے کہتے ہو تو میں کیسے ٹال سکتا ہوں۔ کیوں جانیاں؟"

ماسٹر اچھن راؤ نے اپنے کالے بالوں والا موٹا کھردرا ہاتھ مس دھناسری کے نازک کندھوں پر رکھ کر کہا۔ اور موٹر سٹارٹ کر دی۔

سائیں بابا کا نام سنتے ہی دھناسری راؤ کے کندھے سے لگ گئی۔ سائیں بابا بمبئی کا سب سے بڑا پیر ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، سب کا پیر ہے۔ بمبئی ایسی کاسموپالیٹن جگہ میں جہاں ہر مذہب و ملّت اور ہر خیال کے لوگ بستے ہیں وہاں ایک کاسموپالیٹن فقیر کی بھی ضرورت

ہے جو سائیں بابا نے پوری کر دی ہے۔ خاص طور پر فلم انڈسٹری کے لوگ تو سائیں بابا کے دیوانے ہیں۔ قریباً ہر پکچر کے مہورت سے پہلے سائیں بابا کے مزار پر نیاز اور چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔ پکچر کے دوران میں پھولوں کی چادریں بھیجی جاتی ہیں۔ پکچر اگر کامیاب ہو جائے تو اسے سائیں بابا کا معجزہ سمجھا جاتا ہے۔ فیل ہو جائے تو اپنی حماقت کا ثبوت۔ دونوں صورتوں میں سائیں بابا پر کسی طرح سے حرف نہیں آتا۔ انسانوں اور خداؤں میں یہی فرق ہے۔ آپ انسانوں پر الزام لگا سکتے ہیں۔ خداؤں پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔ اس لئے اچھن راؤ کی جانیاں مس دھنا سری خاموش ہو کے رہ گئی۔

دے روڈ کے اڈے پر اچھن راؤ نے گاڑی کا پٹ کھول کے سرمکھ سنگھ ڈی میلو اور نواز کو اتار دیا۔ وائیلناز ڈی میلو جس کی تھوڑی دورانِ گفتگو میں بھی گردن کے ساتھ ایسا زاویہ قائم کرتی جیسے وہ اب بھی کسی وائیلن پر ٹکی ہوئی ہے۔ مسکرا کے کہنے لگا ـــ

"ماسٹر! ایک گلاس ہمارے ساتھ پینا منگتا؟"

"نہیں نہیں ڈی میلو" اچھن راؤ نے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھ کے کہا "اب رکوں گا تو ہماری جانیاں خفا ہو جائیں گی ـــ کیوں جانیاں۔؟"

اور یہ کہہ کر اچھن راؤ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

جب اچھن راؤ قہقہہ لگاتا ہے تو اس کا جسم یوں کانپنے لگتا ہے جیسے بھونچال آ رہا ہے۔ عام طور پر لوگ قہقہہ لگاتے ہی نہیں۔ جو لگاتے ہیں وہ اتنا مختصر لگاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی قہقہہ نہیں ہے، ایلڈک ہے جسے انہوں نے اپنے منہ میں داب رکھا ہے۔ ذرا منہ کھولا اور قہقہہ غڑاپ سے باہر۔ کچھ لوگ بے آواز قہقہہ لگاتے ہیں۔ محض منہ ہونٹوں سے تالو، تالو تک کھلا ہوا ہے۔ اندر سانس کی نلکی تک نظر آ رہی ہے۔ مگر آواز نہیں آ رہی ہے صرف آنکھوں

کے بار بار کھلنے اور بند ہونے سے معلوم ہو رہا ہے کہ مریض پر قہقہہ طاری ہے۔ کچھ لوگ قہقہے میں آواز نکالتے ہیں۔ مگر یہ آواز اکثر اتنی پتلی، ہنخنی، باریک ہی ہی سی قسم کی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ آواز پھیپھڑوں سے نہیں، آنتوں سے نکل رہی ہے۔ لیکن اچھن راؤ کا قہقہہ اس قسم کا قہقہہ نہیں ہے۔ اس کا قہقہہ اس کے جسم کی طرح بھاری بھرکم ہے۔ وہ جب قہقہہ لگاتا ہے۔ اس کے جسم کی پوری عمارت ہلنے لگتی ہے۔ اس کے جسم کا رواں رواں قہقہے سرمستی و سرشاری میں شامل ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قہقہہ ایک فوارے کی طرح، آتشبازی کے انار کی طرح اس کے سارے جسم سے پھوٹ رہا ہے۔ ہو ہو، ہا ہا ہا کی فلک شگاف آواز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگوں کو بھی بلا وجہ اس کے قہقہے میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اچھن راؤ کا قہقہہ بڑا متعدّی ہے۔

اس وقت یہی ہوا۔ قہقہے کے بیچ میں ڈی میلو اور نواز کو بھی شامل ہونا پڑا۔ ہنستے ہنستے سرمکھ سنگھ کی داڑھی کے کلپ کھل گئے۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ حالانکہ ہنسنے کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن قہقہہ تھا کہ امڈا ہی چلا آ رہا تھا بار رکے۔ سنتری کی آمد نے قہقہے کو بریک لگائی۔ اور اچھن راؤ نے اپنے ساتھیوں سے معافی مانگی۔ اور اپنی جانیاں کو لے کے چلا گیا۔ اور یہ تینوں ساتھی رے روڈ کے شراب خانے میں داخل ہوئے۔

رے روڈ کا شراب خانہ ایک دو منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ نچلی منزل پر بار ہے اوپر کی منزل پر الگ الگ کمرے ہیں۔ جہاں ضرورت مندوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے بہت ہی گھریلو سی فضا ہے اس شراب خانے کی۔ ویٹر حلیم اور بردبار ہیں۔ شکل وصورت سے پیشہ ور سیاست داں معلوم ہوتے ہیں۔ میزیں نہ بہت صاف ہیں نہ بہت گندی ہیں۔ قیمتیں نہ بہت زیادہ ہیں نہ بہت کم۔ ہر طرح کی شراب ملتی ہے۔ ایپل سے لے کر رم تک اور رم سے

لے کر بڈھے تک۔ زندگی بہتی جاتی ہے۔ مزدور کلرک پیشہ دوکاندار، فلم ساز، اوسط درجے کے سرمایہ دار انجنیئر، طالب علم، مختلف کونوں میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ فضا میں تمباکو اور شراب کی بُو ہے۔ پکوڑیوں اور کبابوں کی باس ہے۔ مونگ پھلی کے گھی میں فرائی کئے جانے والے انڈوں کی بساند ہے۔ سگریٹوں کے دھوئیں میں ملی جلی سانسوں کی نمی تیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی جواہر لال نہرو اور سائیں بابا کے کیلنڈر ہیں۔ پارسی بارمین کی موٹی سرخ ناک پر نیلی وریدوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ کبھی کبھی اوپر کی منزل سے کوئی نقرئی قہقہہ تیرتا ہوا نظر آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک لحظے کے لئے بادلوں کے غبار میں سے بجلی چمک گئی۔ نیچے بار میں سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں چہرے ایک لمحے کے لئے اس بجلی کی روشنی سے چمک اٹھتے ہیں۔ کوئی خوبصورت خواب کوئی اندرونی تڑپ، کوئی جذبۂ پنہاں مچل کر بیدار ہو جاتا ہے۔ شوق کی زلف بکھر جاتی ہے اور دیر تک امید کے ماتھے پر لرزتی رہتی ہے۔ اب وہ قہقہہ کسی بوسے میں گھُل گیا۔ وہ بجلی غائب ہو گئی۔ لیکن ماتھے پر وہ زلف ابھی تک لرز رہی ہے۔

نواز سرمکھ سنگھ اور ڈی میلو نے بار میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کہیں کوئی میز خالی نہ تھی۔ صرف ایک کونے میں جہاں دیوار کے اوپر مس کپّن فلم ایکٹریس کی تصویر الٹی ہوئی تھی، وہاں ایک میز خالی تھی وہ تینوں جلدی سے اُدھر لپکے۔ بیرا ان کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی بیٹھنے نہ پائے تھے کہ بیرے نے آکے بہت لجاجت سے کہا—

”حضور یہ میز دی جا چکی ہے —“

”کس کو؟“ سرمکھ نے داڑھی میں کلپ لگاتے ہوئے کہا —

”ایک صاحب ہیں —“

”چار کرسیاں ہیں۔ ہم تین ہیں۔ پھر بھی ایک کرسی خالی رہتی ہے۔“ نواز نے ذرا غصّے سے کہا۔

”مگر یہ میز تو دی جا چکی ہے حضور۔“

ڈی میلو نے وائلن کا کیس دیوار پر لٹکاتے ہوئے کہا کوئی بات نہیں۔ جب وہ صاحب آئیں گے ہم اُٹھ جائیں گے۔ جب تک تم تین بڑے سکاچ لاؤ۔

”ارے یہ کس نے مس کجّن کی تصویر الٹی لٹکا رکھی ہے؟ نواز نے دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو ٹھیک کیا—“ حیرت ہے کسی کو اس طرف خیال نہیں آیا کہ . . . .“

”لو ہیرو — !

تین بڑے سکاچ آ گئے تھے۔ ڈی میلو، نواز اور سرمکھ نے جلدی سے گلاس اٹھا لئے۔

سرمکھ کے پیاسے ہونٹوں اور پیاسی آنکھوں کے درمیان شاید کوئی راستہ تھا۔ جہاں شراب اس کے ہونٹوں سے گزر کر سیدھی اُس کی آنکھوں میں پہنچ جاتی تھی۔ دوسرے ہی گھونٹ میں اُس کی آنکھیں شرابی ہو گئیں۔ بڑے مزے میں بولا۔

”یہ شراب خانہ ہے دوست! یہاں تھوڑی دیر میں ہر چیز الٹی دکھائی دینے لگتی ہے۔ تم مس کجّن کی تصویر کو رو رہے ہو، یہاں اپنے دوست الٹے نظر آنے لگتے ہیں۔“

اوپر کے کسی کمرے سے کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ سرمکھ سنجیدہ ہو گیا آہستہ سے بولا۔

”وہ سالا تو اپنی جانیاں کے ساتھ چلا گیا۔ ہم کس کے ساتھ جائیں؟“

سرمکھ کے لہجے میں بہت افسردگی اور ناامیدی تھی اس نے جلدی سے گلاس خالی کر دیا۔ اور بیرے کو دوسرے پیگ کے لئے کہا۔

”اتنی جلدی نہ چلو! نواز نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

”بہت اچھا میرے باپ!“ سرمکھ نے ہاتھ جوڑ کے داڑھی ہلاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ایک دبلا پتلا، لانبا آدمی ہاتھ میں چھاتا لئے چلتا ہوا ان کی میز کے قریب آیا۔ اس

کے ساتھ ساتھ وہی بیرہ آ رہا تھا ۔۔۔

بیرے نے کہا ۔۔ " یہ حضور کی میز ہے ۔ "

سرکھ سنگھ اور نواز کھڑے ہو گئے ۔ ڈی میلو ابھی کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ اس آدمی نے بہت میٹھی اور دھیمی آواز میں کہا ۔۔۔

" نہیں آپ اپنا گلاس ختم کر لیجئے ۔ جب تک میں یہاں کونے میں کھڑا رہتا ہوں ۔ "

نواز نے اس آدمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا سر پر گول ٹوپی ۔ بند گلے کا گہرا نیلا کوٹ اڈکر کی سفید پتلون جس کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر تھے ۔ جوتے میلے اور سیاہ چہرے پر مونچھیں بھی میلی اور سیاہ تھیں ۔ اور کونے گرے ہوئے تھے ۔ آنکھیں بھی بہت میلی اور سیاہ تھیں اور متذبذب کہیں ایک جگہ نہیں ٹھہرتی تھیں ۔۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی زبان پھیر رہا تھا ۔ اس کا ماتھا تنگ اور گھٹا ہوا تھا اور اس پر گہرے فکر کی شکنیں ابھر آئی تھیں ۔ نواز کو وہ آدمی مریض معلوم ہوا ۔ اس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔۔۔

" آپ کھڑے کیوں ہیں ۔ یہاں بیٹھ جائیے نا ۔ ہمارے دوست نے دوسرا پیگ منگا لیا ہے ۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو ہم بھی ! اور وہ بھی اگر آپ اجازت دیں ۔ تو ہم بھی دوسرا پیگ منگا لیں ۔ آپ کیا پیئں گے ۔۔۔ ؟ "

" کوئی ہرج نہیں ہے ۔ " اس آدمی نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی چھاتا کونے میں ٹکا دیا ۔ اور خود کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ۔۔۔

" میرے بیرے کو معلوم ہے ، میں کیا پیتا ہوں ۔۔ دو کتوں والی رم ۔

تفہیمات

ابوالکلام آزاد

(تفہیمات تفسیر کے مجموعوں میں ایک گراں قدر اضافہ)

امام الہند کے سوز دروں نے قرآن پاک کو مطالب و معنی کے جس نئے اُفق سے رُوشناس کرایا ہے۔ تفہیمات اُس کی ایک تابندہ مثال ہے

سفید کاغذ ٭ دو صد صفحات
خوشگوار کتابت ٭ مضبوط جلد

قیمت: ۲۰ روپے

محمود پبلی کیشنز۔ چوک اردو بازار۔ لاہور